نمرہ احمد

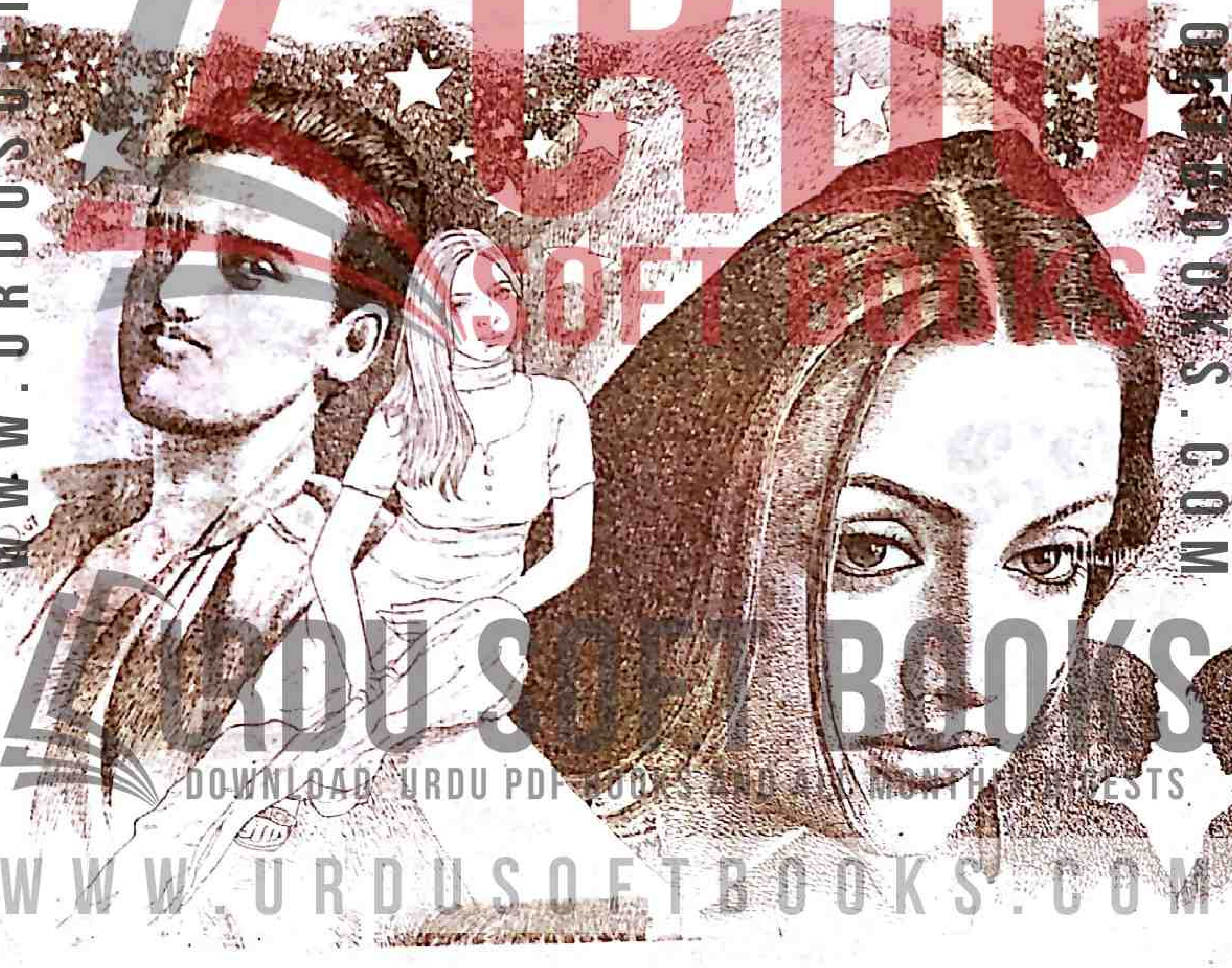
حالم

"آب زیدان" (ایکوریم)

زندگی کے اس سفر میں
ہر چیز کا دایاں اور بایاں "پر" ہے۔
محبت کے پنکھ کے لیے غصہ ہے
قسمت کے پنکھ کے لیے خوف ہے
درد کے پنکھ کے لیے شفا ہے

زخم دینے والے پنکھ کے لیے معافی ہے
غرور کے پنکھ کے لیے عاجزی ہے
آنسوؤں کے پنکھ کے لیے خوشی ہے
وقار کے پنکھ کے لیے ذلت ہے
چھوڑ دینے کے پنکھ کے لیے سنبھالے رکھنا ہے
ہم صرف دو پروں کے ساتھ اڑ سکتے ہیں

مکمل ناول



اور دونوں پر ہوا میں تب ہی ٹھہر سکیں گے
جب ان میں ہو گا توازن!
دو خوب صورت پر ہی ہیں اصل کاملیت!
مگر
انسانوں کی ایک نسل ہے جو سمجھتی ہے کہ
کاملیت ان میں سے ایک پر کے
ہر وقت موجود ہونے کا نام ہے
لیکن مجھ سے پوچھو تو
ایک پنکھ والا پرندہ نامکمل ہے
ایک پر والا فرشتہ نامکمل ہے
ایک پر والی تتلی مردہ ہے
سو یہ لوگ جو کاملیت کو پانے کے لیے
اپنے ایک پر کو کاٹ کر پھینک دینے میں لگے ہیں
انہوں نے بنا ڈالی ہے
ایک معذور نسل انسانی!

(سی جوائے بیل سی)

"اور میں آپ کو اس کیس کے بارے میں وہی کچھ کہوں گا جو میں نے پہلے دن عدالت میں کہا تھا۔ میں بے گناہ ہوں اور میں نے سعدی یوسف پہ حملہ نہیں کیا تھا۔ عدالت کیا فیصلہ کرے گی، یہ میں نہیں جانتا، لیکن میں نے یہاں آپ کو اس بات کے لیے نہیں بلایا۔"

ہاشم کاردار بالکل ٹھہر گیا۔ آنکھوں میں بے یقینی اور حیرت لیے وہ یک ٹک اسے دیکھے گیا۔ رپورٹرز دھڑا دھڑ لکھے جا رہے تھے۔ کلک کلک تصاویر اتاری جا رہی تھیں۔

"میں آج۔۔۔ اعلانیہ اپنی کمپنی کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ یہ کمپنی ہم نے اچھی نیت سے شروع کی تھی اور اس کو چائنہ میں رجسٹرڈ کروایا تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہم ٹربائن بنا کر حکومت کو بیچیں تاکہ وہ ان کو تھر کول پاور پراجیکٹ میں کوئلے سے گیس بنانے کے عمل میں استعمال کر سکے۔ میری کمپنی آج اس

اٹھائیسویں قسط



آسامی کے لیے حکومت کی نظر میں ایک مضبوط امیدوار ہے اور ہو سکتا ہے کہ ہم یہ ٹینڈر لے بھی جائیں مگر۔"

ہاشم بالکل سُن سا کھڑا تھا۔ یک دم بجلی بند ہو گئی۔ ہال میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ شور سا بلند ہوا۔ ہا ہو کی آوازیں آئیں، مگر ایونٹ آرگنائزر جلدی جلدی سب کو خاموش کرانے لگا۔ کیمروں کے فلیش آن کر لیے گئے۔ اندھیرے میں پھر سے سفید روشنی ہو گئی۔ صرف مائیک کا مسئلہ تھا، مگر پوڈیم پہ کھڑے نوشیرواں کو پروا نہ تھی۔ وہ سر اٹھا کے بولے جا رہا تھا۔ مزید بلند آواز میں۔

"مگر میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میری کمپنی جو ٹربائن بنا رہی ہے اور جس میں میرے خاندان نے کروڑوں روپیہ لگایا ہے، وہ ٹربائن ناقص ہے۔ مجھے یہ اعتراف کرنے دیں کہ اس لوڈشیڈنگ سے لڑنے کے لیے۔" انگلی اٹھا کر اندھیرے ہال کی طرف اشارہ کیا۔ "اس اندھیرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تھر کے جس کوئلے کو زمین کے اندر ہی گیس بنایا جانا تھا، اس عمل کے لیے اگر کسی کمپنی کے ٹربائنز کارگر ہیں تو وہ شیل ہے۔ شیل کے علاوہ اس خطے کی تمام کمپنیز کی ٹربائنز ناکارہ ہیں اور وہ UCG یعنی زیر زمین کوئلے کو گیس بنانے کے عمل (یعنی کوئلے کو کھود کر نکالے بغیر اندر ہی گیس میں تبدیل کر دینے) کے لیے مکمل طور پہ ناکارہ ہیں۔ یہ پراجیکٹ اگر کسی کمپنی کو ملنا چاہیے تو وہ شیل ہے۔ شیل کے علاوہ حکومت اگر کسی اور کمپنی کو یہ کام سونپتی ہے تو وہ عوام کے ساتھ دھوکا کرے گی اور عوام کے ٹیکسوں سے حاصل ہونے والی آمدنی کو غلط جگہ استعمال کرے گی۔"

پسینے پسینے ہوا نوشیرواں موبائلز اور فلیش لائٹس کی روشنی میں سارے ہال سے یکتا اور روشن نظر آ رہا تھا۔ آگے پیچھے ہر جگہ اندھیرا تھا۔ بس اس کا چہرہ روشن تھا۔ چمکتا ہوا۔ ساری مداخلت اور بدانتظامی کے باوجود اب سب خاموشی سے اسے سن رہے تھے۔

"میں اس کمپنی کے سی ای او کی حیثیت سے آج ریزائن کر رہا ہوں۔ کیونکہ میں اتنے بڑے پراجیکٹ کا اہل نہیں ہوں۔ میرے خلاف چلنے والے ٹرائل سے میں نے یہ سیکھا ہے کہ میں ابھی تک کچھ نہیں سیکھ پایا۔ اس لیے میں باعزت طور پہ اپنی کمپنی سے الگ ہو کر ایک ملٹی نیشنل میں جاب کے لیے اپلائی کر رہا ہوں۔ جیسے میرے باپ اور بھائی نے محنت کر کے اپنا راستہ بنایا اس طرح میں بھی مشکل راستہ چن رہا ہوں۔ اگر میں لوڈشیڈنگ کو ختم نہیں کر سکتا، تو کم از کم میں ان طریقوں کی حمایت بھی نہیں کروں گا۔ جو اس مسئلے کو بڑھاتے ہیں، گھٹاتے نہیں۔ اس لیے نہ صرف میں اپنی کمپنی سے مستعفی ہو رہا ہوں بلکہ اپنی پیرنٹ کمپنی جو کہ ایک IPP ہے، سے بھی ریزائن کر رہا ہوں اور آخر میں ایک اور بات۔"

بلند آواز میں کہتے ہوئے اس نے کاغذات کا ایک پلندہ ان کو دکھایا۔

"میں اس پیپر کو پبلش کر رہا ہوں اور اس کی ایک کاپی آپ سب کو دس منٹ پہلے ای میل کر دی گئی ہے۔ اس میں، میں نے آئی پی پی ز کے حکومت سے معاہدوں پہ روشنی ڈالی ہے، کیونکہ میں مزید اب اس نظام کا حصہ نہیں بننا چاہتا جس میں ہم آئی پی پی ز پورے پیسے لے کر آدھی بجلی بناتے رہیں۔ میں اس کو بدل نہیں سکتا، مگر اس کے خلاف آواز ضرور اٹھا سکتا ہوں۔ جانتا ہوں کہ مجھے اب Whistleblower (مخبر) کہا جائے گا اور مجھے شاید کوئی کمپنی جاب نہ دے اور کوئی میرے ساتھ کاروبار نہ کرے، کیونکہ رات تک لوگ میری کمپنی سے پیسہ نکال کر اسے دیوالیہ کر دیں گے، لیکن میں اب مزید خاموش نہیں رہوں گا۔ میں اپنی تمام کمپنی کی پوزیشنز سے استعفیٰ دیتا ہوں۔ شکریہ۔"

اب وہ پوڈیم سے اُتر آیا تھا، مگر ہاشم یک ٹک پتھر کا بت بنا اسے دیکھ رہا تھا۔ رپورٹرز شہد کی مکھیوں کی طرح اس پہ سوالوں کے لیے جھپٹے تھے، مگر وہ خاموشی سے

آگے بڑھتا جارہا تھا۔ وہ زینے خود چڑھا تھا اور وہ زینے خود اُتر رہا تھا۔ ہاشم کے ہاتھ برف ہو رہے تھے۔ وہ اندھیرے میں تنہا کھڑا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

مجھے سکون میسر نہیں تو کیا غم ہے
گلوں کی عمر تو کانٹوں کے درمیاں گزری

چھ دن بعد۔

مورچال پہ رات گہری ہو کر اُتر رہی تھی۔ سب سو چکے تھے، مگر حنین لاؤنج میں موجود تھی' آستینیں اوپر چڑھائے' وہ اسٹول پہ کھڑی' دیوار پہ اسٹینسل لگا کر اس کو پینٹ کر رہی تھی (stencil پلاسٹک کا بڑا سا ٹکڑا جس میں ڈیزائن کی جگہ خالی ہوتی ہے جیسے عموماً ہاتھ پہ مہندی لگانے کے لیے ہتھیلی پہ رکھ کر اوپر مہندی لگادی جاتی ہے اور جب پلاسٹک اٹھاؤ' تو نیچے نقش و نگار بن چکے ہوتے ہیں۔) اس کے اسٹینسل پہ بڑا سا درخت کٹا ہوا تھا اور وہ احتیاط سے اس پہ برش پھیر رہی تھی۔

اندر زمر اپنے کمرے میں اسٹڈی ٹیبل پہ بیٹھی کام کر رہی تھی۔ گاہے بگاہے نگاہ اٹھا کر گھڑی کو بھی دیکھ لیتی۔ گیارہ بجنے کو آئے تھے اور فارس نہیں آیا تھا۔ اور اسی پل اچانک اس کا فون بجا۔

فارس کالنگ۔ دیکھ کر لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی' مگر جب موبائل کان سے لگایا تو لہجہ خشک بنالیا۔

"جی کہیے۔"

"اہم۔" وہ کھنکھارا تھا۔ "کدھر ہو؟"

"گھر پہ۔ اور کہاں ہو سکتی ہوں؟"

"ایک ایڈریس ٹیکسٹ کر رہا ہوں' ادھر آجاؤ۔"

"اس وقت؟ مگر کیوں؟"

"ایک اہم گواہ سے ملوانا ہے۔ زیادہ سوال مت پوچھو' بس ایک گھنٹے کے اندر ادھر پہنچو اور سنو' صرف تم آنا۔ ساتھ میں پورے گھر کو مت لے آنا۔"

زمر نے چونک کے گھڑی کو دیکھا۔ بارہ بجنے میں ایک گھنٹہ تھا۔ ایک بھرپور مسکراہٹ اس کے لبوں پہ بکھر گئی۔

"اور اگر میں نہ آؤں تو؟" لمحے بھر کے توقف سے وہ بولا۔

"پتا بھیج رہا ہوں۔ جلدی آؤ۔" اس کی توقع کے خلاف اس نے کوئی تپانے والا جملہ کہے بغیر فون بند کر دیا۔ زمر نے مسکرا کر اسکرین کو دیکھا جہاں اس کا پیغام جگمگا رہا تھا۔ پتا پڑھ کر اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔

حنین نے ابھی درخت کی پہلی شاخ مکمل کی تھی جب کھلتے دروازے کی آواز پہ وہ چونکی۔ زمر آہستہ سے کمرے سے باہر آکر دروازہ بند کر رہی تھی۔ سیاہ ڈیزائنر ویئر پہنے' ہلکا میک اپ' ایئر رنگز' کہنی پہ پرس لٹکا ہوا۔ حنین نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"آپ اس وقت کس کی شادی میں جارہی ہیں؟"

"اپنی شادی کی اینورسری میں جارہی ہوں۔" زمر نے بہت سکون سے تصحیح کی۔ حنین چونکی۔

"کل بیس مئی ہے؟ ایک سال ہو گیا؟"

"کل نہیں۔ ابھی بارہ بجے سے بیس مئی ہے اور فارس صاحب کو اتنے دن سے ڈنر ڈنر کرنے کے بعد بالآخر آج وقت مل ہی گیا مجھے ڈنر پہ بلانے کا۔"

حنہ کی آنکھیں چمکیں۔ "کہاں بلایا ہے؟"

"ہم دونوں کے لیے ایک یادگار جگہ ہے وہ۔ زیادہ سوال مت پوچھو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"ویسے ان کو چاہیے تھا آپ کی مرضی کی جگہ پہ لے کر جاتے آپ کو۔ ٹیبل ریزرو کر کے بتا رہے ہیں اب۔"

"وہ تو گواہ کو ملوانے کا بہانہ کر کے بلا رہا ہے' مگر اکیلے آنے کا کہنا اور وہ بھی بیس مئی کی رات... ظاہر ہے وہ مجھے سرپرائز دینا چاہتا ہے۔ او کے' اللہ حافظ۔"

وہ مسکرا کر اس کو الوداع کہتی باہر کی طرف بڑھ گئی۔ خواہ مخواہ حنین کے دل نے تمنا کی کہ وہ آج پھر چابیاں بھول جائے اور واپس آئے' مگر وہ عجلت میں تھی۔ خیر' حنہ سر جھٹک کر کام کرنے لگی۔

وہ درخت کی اوپری چار شاخیں بہت محنت اور احتیاط سے پینٹ کر چکی تھی، جب بیرونی دروازے کا لاک کھلنے کی آواز آئی۔ پھر اندر آنے کی آہٹ۔ حنہ چونک کر پلٹی۔ فارس چابیاں دروازے کے قریب ٹوکری میں ڈالتا اب ادھر آ رہا تھا۔ حنین نے فوراً گھڑی میں دیکھا۔ بارہ بجنے میں دس منٹ تھے۔ اسے شدید غصہ آیا۔

"یعنی آپ تو واقعی گواہ سے ملوانا تھا اور وہ اتنی خوش کہ آپ ان کو ڈنر پہ بلا رہے ہیں۔ ویسے کون سا گواہ تھا یہ؟"

اندر آتے فارس نے رک کر اسے دیکھا جو اسٹول پہ کھڑی تھی اور ہاتھ میں اسٹینسل، برش اور پینٹ کی پلیٹ تھی۔ دوسرے ہاتھ میں ٹشو تھا۔

"وعلیکم السلام حنین۔" وہ تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

"تاریخ بھول گئی تھی کیا؟ ڈنر پہ کیوں نہیں گئے؟"

"کیا شروع ہو گئی ہو گھر آتے ہی؟" وہ ناسمجھی اور اکتاہٹ سے بولا۔ حنین نے ٹھہر کے پہلے اسے دیکھا۔ پھر اس کے کندھے کے پیچھے۔

"زمر آپ کے ساتھ نہیں آئیں؟" اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔

"وہ میری ساتھ تو نہیں تھی۔ میں تو ابھی آ رہا ہوں۔" وہ حیران ہوا تھا۔ حنین کے قدموں سے زمین سرکنے لگی۔

"آپ نے ابھی ابھی ان کو کال کی تھی اور کہا تھا کہ آپ کو ان کو کسی گواہ سے ملوانا ہے... ہے نا...." وہ ہکلائی۔ چند لمحے لگے فارس کو اس کی بات سمجھنے میں

اور ایک دم اس کا پورا دماغ سنسنا اٹھا۔ وہ تیزی سے اس کے قریب آیا۔

"حنہ! میں نے اسے کوئی کال نہیں کی۔ کہاں ہے وہ؟"

حنین کے ہاتھ سے پینٹ، برش سب پھسل گیا۔

"آپ نے ان سے کہا کہ اکیلی آنا۔ وہ اکیلی چلی گئیں۔ وہ خوش تھیں۔ بہت زیادہ۔" اس کا گلا رندھا۔ وہ دم بخود کھڑی تھی۔

"کدھر۔ کدھر گئی ہے وہ؟" وہ حواس باختہ سا پوچھ رہا تھا۔ شل سی حنین نے نفی میں سر ہلایا۔

"یہ نہیں بتایا۔" فارس بے اختیار پیچھے کو بھاگا۔ ٹوکری سے چابی اٹھائی اور موبائل پہ نمبر ڈائل کرتے اس نے دروازہ کھولا۔

زمر کا فون آف جا رہا تھا۔

اس کی سماعت میں ایک فقرہ گونج رہا تھا۔

He cannot protect his women!

(وہ اپنی عورت کی حفاظت نہیں کر سکتا)

"اوہ خدایا!! وہ اتنے دنوں سے غلط عورت کی حفاظت کر رہا تھا؟ اوہ خدایا...."

✡ ✡ ✡

قتل سے چھ دن قبل

قصر کاردار کی ساری بتیاں رات کے اس پہر بھی روشن تھیں۔ اندر داخل ہوتے نوشیرواں نے گہری سانس لی اور پھر قدم اٹھانے لگا۔ جیسے جیسے وہ چلتا آیا، لاؤنج قریب آتا گیا اور بالآخر وہ بڑے صوفے کے بالکل سامنے آٹھہرا جہاں ہاشم بیٹھا تھا۔ اس نے کوٹ نہیں پہن رکھا تھا۔ شرٹ کی آستینیں کہنیوں تک موڑ رکھی تھیں اور ٹائی ڈھیلی تھی۔ آہٹ پہ اس نے صرف آنکھیں اٹھائیں جو بے تاثر سی لگتی تھیں۔ مردہ سی۔ پریس کانفرنس کے چند گھنٹے بعد اب ان دونوں کی ملاقات ہو رہی تھی۔

"ویلکم ہوم!" وہ شیرو پہ نظریں گاڑے بولا تو آواز

ایسی سرد تھی کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔

"آپ کو جو بھی کہنا ہے میری پریس کانفرنس کے بارے میں بھائی، وہ آپ...." وہ ہاتھ اٹھا کے کہنے لگا مگر ہاشم نے اس کی بات کاٹ دی۔

"یہ ایکوریم دیکھ رہے ہو اپنے پیچھے؟" وہ ٹھنڈے

سے انداز میں شیرو پہ نظریں جمائے ہوئے تھا۔
نوشیرواں نے گردن موڑ کر دیکھا۔
لاؤنج کی ایک دیوار کے ساتھ نصب وہ ایک خوب صورت سا ایکوریم تھا جو برسوں سے اس گھر کا حصہ رہا تھا۔ اس کی شیشے کی مستطیل دیواروں میں ڈھیروں پانی جمع تھا، مصنوعی پودے اور پتھر اندرونی فرش پہ بچھے تھے اور چند مچھلیاں دائیں سے بائیں تیر رہی تھیں۔ روشنیاں کچھ اس طرح لگی تھیں کہ اندرونی ماحول کو منور کیے ہوئے تھیں۔

"تمہیں یاد ہے یہ ایکوریم کون لایا تھا؟ نہیں....." اس نے دائیں بائیں گردن ہلائی۔ "تمہیں کہاں یاد ہوگا، مگر بیٹھو۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔"

اسے اشارہ کرکے وہ خود اٹھا اور قدم قدم چلتا ایکوریم کے قریب آرکا۔ وہ نوشیرواں کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی اداس آنکھیں شیشے کے مچھلی گھر پہ جمی تھیں۔ شیرو نہیں بیٹھا۔ اسی طرح کھڑا رہا۔ متذبذب، خفا سا۔

"تم سترہ سال کے تھے۔ میں تمہیں اپنے ساتھ ایک ایگزیکٹو میٹنگ میں لے گیا تھا، تھری پیس میں ڈریس اپ کروا کے۔ تم اپنی عمر سے بڑے اور اچھے لگ رہے تھے۔ ڈیڈ کو بھی خوشی ہوئی تھی تمہارے آنے سے، مگر حسب عادت وہ ظاہر نہیں کر رہے تھے۔ تم البتہ بے نیاز سے تھے۔ ہمارے ساتھ جاکر بیٹھ گئے تھے اور ہماری باتیں سننے لگ گئے تھے۔ ہم ایک ڈیل کرنے جارہے تھے اور ہمیں معلوم تھا کہ دوسرا فریق بعد میں تھوڑے بہت ہیر پھیر سے کام لے گا، مگر یہ بات ہمیں ان کے منہ پہ نہیں کہنی تھی۔ ہمیں سمجھوتا کرنا تھا، صرف نظر سے کام لینا تھا۔" وہ اب ہولے ہولے شیشے کی دیوار پہ دستک دے رہا تھا۔ اندر تیرتی مچھلیاں مزید تیزی سے بل کھاتی ادھر ادھر چکر کاٹنے لگی تھیں۔

"مگر..... جب تمہیں اس دوران اس بات کا احساس ہوا کہ وہ بعد میں چیزوں کو manipulate (گڑبڑ) کرسکتے ہیں، تو تم نے ایک دم بڑھ چڑھ کے بولنا شروع کردیا۔ ہمارے جی ایم نے تمہیں آنکھیں دکھائیں، ڈیڈ کھنکھارے، مگر تم نے اپنی بات مکمل کرکے دم لیا۔ وہ لوگ تحفظات کا شکار ہوگئے اور انہوں نے ہم سے معذرت کرلی۔ ڈیڈ تم پہ بہت غصہ تھے اور مجھ پہ بھی کہ میں تمہیں لایا ہی کیوں، مگر مجھے اطمینان تھا۔ دو باتوں کا اطمینان۔ ایک تو یہ کہ تم میں اتنی سمجھ ہے کہ غلط اور صحیح کا فرق کرسکو۔ بے شک "عقل" نہیں ہے کہ کس وقت بولنا ہے کس وقت نہیں، مگر چلو، سمجھ تو ہے۔ اور دوسرا یہ کہ تم "درست فیصلہ" کرنے کی صلاحیت رکھتے ہو۔ اس دن میں تمہارے لیے یہ ایکوریم لایا تھا اور اس کو ہمارے لاؤنج میں رکھوایا تاکہ تم گزرتے ہوئے اس کو دیکھتے رہو اور تمہیں اپنا بزنس میں دلچسپی لینا بھول نہ جائے۔"

وہ اب بولتے ہوئے ایک پہلی کی کانچ کی دیوار کے کنارے پہ انگلی پھیر رہا تھا، گویا کوئی لکیر کھینچ رہا ہو۔ شیرو کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑچکے تھے اور وہ خاموشی سے کھڑا تھا۔

"مگر تم بھول گئے۔ بزنس میں دلچسپی لینا، اپنی سمجھ بوجھ، درست فیصلے کرنے کی طاقت، تم سب بھول گئے۔ میں نہیں بھولا۔ میں اس کی مچھلیاں بدلواتا رہا۔ جب کوئی مرجاتی تو اس سے ملتی جلتی مچھلی اندر ڈلوا دیتا۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب اس کی مچھلیوں کی خوراک کا میں نے ملازموں سے پوچھا نہ ہو۔ میں تمہیں اکثر بزنس میٹنگز میں جانے سے پہلے یہ ایکوریم یاد کرواتا تھا تاکہ تم سمجھ سکو کہ کاروبار کے سمندر میں تم ڈوب نہیں سکو گے اگر تیرنا سیکھ لو۔ میں نے اپنی امید نہیں کھوئی۔ تم نے سعدی کو گولی ماری، تم نے علیشا کو واپس بلایا، اس کو کمپنی میں سے حصہ دیا، ملک سے بھاگنے کے بجائے ٹرائل کا سامنا کرنے کا فیصلہ کیا، میں اس کی مچھلیوں کی حفاظت کرتا رہا۔ تم مجھ سے دور ہوتے گئے، زمر سے قریب ہوتے گئے، ممی سے بدتمیزی کرتے رہے، میں نے اپنی امید نہیں کھوئی، مگر

آج شام۔"

اب کے وہ پورا گھوما تو نوشیرواں نے اس کا چہرہ دیکھا' اس کی کنپٹی پہ جمی ملال بھری آنکھیں دیکھیں اور اس کے دل کو کچھ ہوا۔

"آج جب تم نے پریس کانفرنس کر کے اپنی کمپنی کو دیوالیہ کر دیا' ہماری پیرنٹ کمپنی کو نقصان پہنچایا' تم نے اپنے ہی خاندان کے کاروبار کے خلاف whistleblowing کی' تم نے ہمارے کانٹریکٹس پہ تنقیدی پیپر لکھ کے پبلش کر دیا' آج تم نے میری کمر میں خنجر گھونپا تو شیرو! میں نے تم سے آخری امید بھی کھو دی۔ تم نوشیرواں' اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں تو اچھے فیصلے کر سکتے ہو' مگر کاروبار میں تم ہمیشہ فیل رہو گے اور اسی لیے اب سے تم صرف میرے بھائی ہو۔ کل آفس آ کر اپنی چیزیں لے جانا اور دوبارہ اس بلڈنگ میں قدم نہ رکھنا۔"

"کیا آپ اب بھی میرا کیس لڑیں گے؟" اس سوال پہ ہاشم تلخی سے مسکرایا۔

"نہیں اب تمہارا کیس پہلے سے زیادہ جانفشانی سے لڑوں گا شیرو! کیونکہ تم میرے بھائی ہو اور اپنی عقل سمجھ سب کھو چکے ہو۔ میرے لیے تمہیں بچانا اب زیادہ ضروری ہو گیا ہے۔ مگر ہاں' تم نے مجھے آج بہت بڑا دکھ دیا ہے۔ میں نے کیا نہیں کیا اس سارے خاندان کے لیے اور تم سب نے مجھے ہر طرف سے نقصان پہنچایا۔ کیا اپنے بھائی کے ساتھ ایسے کیا جاتا ہے شیرو؟"

نوشیرواں نے سر جھکا دیا۔ "آئی ایم سوری آپ کو ہرٹ کرنے کے لیے' مگر میں اپنے فیصلوں پہ نادم نہیں ہوں۔ میں نے وہ کیا جو مجھے ٹھیک لگا۔"

"اور میں اب وہ کروں گا جو مجھے ٹھیک لگے گا۔ بہت ہو گیا میرا نقصان' اب جوابی حملہ کرنے کا وقت ہے۔"

شیرو نے چونک کے اسے دیکھا۔ "آپ کیا کریں گے؟"

"تم جا کر سو جاؤ۔" اس نے ہاتھ جھلا کے ذرا نرمی سے اس کو جانے کا اشارہ کیا۔ شیرو بھی نہیں رکا۔ خاموشی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ اپنے کمرے کے دروازے پہ کھڑی جواہرات اس کے جاتے ساتھ ہی بولی تھی۔

"جب تم اپنے خاندان کو خود سے دور کرو گے تو یہی ہو گا ہاشم!"

ہاشم نے گردن موڑ کے ایک سرسری نظر اس پہ ڈالی۔ "میں ابھی تک کچہری میں وکیلوں کے سامنے اپنی بے عزتی بھولا نہیں ہوں۔ مجھے کچھ وقت لگے گا۔ ممی! تب تک میرے سامنے نہ آئیں تو اچھا ہے۔ میری اینجیو۔" آخر میں وہ اتنی بلند آواز میں دھاڑا تھا کہ جواہرات کا جسم تھرا اٹھا۔

"یس سر!" میری دوڑتی آئی۔

"اس ایکوریم کو میرے آفس میں منتقل کروا دو۔ اب اس کی یہاں کوئی ضرورت نہیں ہے اور میں پانی میں سانس لیتی مچھلیوں کو بے گھر نہیں کرنا چاہتا۔" وہ اب مدھم آواز میں ہدایت دے رہا تھا اور جواہرات بے بسی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اجنبی ہوتا جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

تمام عمر جلاتے رہے چراغ امید
تمام عمر امیدوں کے درمیاں گزری

اگلی شام میں وہ دوبارہ اسپتال آیا تاکہ اس اپاہج لڑکے کی خیریت اور طبیعت دریافت کر سکے۔ آج اس کو ڈسچارج کیا جانا تھا اور سعدی اس سے پہلے ایک دفعہ اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اسپتال کی راہداریوں میں وہ خاموشی سے آگے بڑھتا گیا۔ دواؤں اور اسپرٹ کی بو اور عجیب سی ویرانی' در و دیوار سے ٹپکتی تھی۔ ابھی اسے چند طویل راہداریاں عبور کر کے مطلوبہ وارڈ تک پہنچنا تھا۔ راستہ طویل تھا اور دل پہ بوجھ ڈالنے والا بھی تھا۔ اس نے رفتار سست کر دی۔ کبھی دائیں اور کبھی

بائیں دیکھتا ہولے ہولے قدم اٹھانے لگا۔

اسپتال بھی عجیب جگہ ہے۔ یہاں آکر احساسات عجیب سے ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کی آوازیں‘ شور‘ پکاریں اور ساتھ میں خاموشی۔۔۔ اس نے ہینڈز فری کانوں میں ٹھونس لی اور موبائل کی اسکرین کو سر جھکا کے دیکھتا‘ مطلوبہ آیات کو چھوتا آگے بڑھتا گیا۔

دل کو‘ مریض کی عیادت بھی نرم کرتی ہے اور قرآن کی تلاوت بھی۔ وہ ان دونوں کو ملانے لگا‘ شاید کہ اثر بڑھ جائے۔

"میں پناہ چاہتا ہوں اللہ کی‘ دھتکارے ہوئے شیطان سے۔"

"شروع کرتا ہوں اللہ کے نام کے ساتھ جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔"

اب وہ پھر سے اطراف میں دیکھنے لگا تھا۔ قطار در قطار بیڈ۔۔۔ کھلے دروازوں سے جھانکتے بے حال‘ زرد چہروں والے لوگ۔۔۔ وحشت سی وحشت تھی۔

"اور بے شک آپ کا رب تو لوگوں پر فضل کرتا ہے

لیکن ان میں سے اکثر شکر نہیں کرتے۔" (النمل ۷۳)

"شکر کیا ہے اللہ تعالیٰ؟"

وہ بول نہیں رہا تھا‘ سوچ رہا تھا اور اسی طرح قدم بڑھا رہا تھا۔

"آخر یہ شکر کہتے کس کو ہیں؟ جب کچھ پاس نہ ہو تو وہ آنکھ رکھنا جو "وہ" دیکھ لے جو کبھی نہ کبھی ضرور ملے گا‘ لیکن کچھ نہ کچھ تو ہر پل پاس ہوتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ آپ لوگوں پہ فضل کرتے ہیں۔ فضل "زائد" دینے کو کہتے ہیں۔ حق سے‘ اوقات سے بڑھ کر دینے کو۔ جیسے آپ ہمیں نعمتیں دیتے ہیں‘ ویسے ہی آپ ہمیں "مواقع" بھی دیتے ہیں۔ صرف مادی چیزوں دولت‘ اولاد‘ کامیابی پہ شکر کرتے ہوئے ہم بھول جاتے ہیں کہ ہمیں "مواقعوں" پہ بھی شکر کرنا ہے۔

چانسز پر۔ ہم میں سے جن کے ماں باپ گزر چکے ہیں اور وہ ان کی خدمت نہیں کر سکے۔۔۔ وہ برسوں پچھتاووں اور ملال میں گھرے رہتے ہیں کہ کیا تھا اگر اللہ ان کو زندہ رکھتا اور وہ ان کی خدمت کر پاتے؟ مگر ہم یہ نہیں دیکھتے کہ اللہ ہمیں دوبارہ موقع ضرور دیتا ہے‘ کسی بوڑھے کو ہمارے قریب لا بٹھاتا ہے چاہے ساس سسر ہوں‘ کوئی لاچار بزرگ ہمسایہ ہو یا کوئی بوڑھا ملازم‘ کوئی ہوتا ہے ہمارے گرد جس کی خدمت کی جا سکتی ہے‘ مگر اپنے پچھتاووں میں ہم مواقع ضائع کر دیتے ہیں۔ ہم ان کو اپنے ماں باپ کی طرح نہیں سمجھ سکتے‘ اور سارا مسئلہ یہی ہے کہ ان کو والدین نہیں سمجھنا۔ نہ ان سے والدین کی طرح محبت کرنی ہے۔ صرف ان کی عزت اور خدمت کرنی ہے۔ شادی سے پہلے لڑکیاں چھوٹے بہن بھائیوں کو بہت جھڑکتی ہیں‘ بعد میں پچھتاتی ہیں‘ مگر صرف پچھتانے کا کیا فائدہ جب اپنے اردگرد ویسے ہی چھوٹے بچے دیکھنے اور ان سے نرمی کرنے والی بصیرت ہی نہ رکھے انسان۔ ہم مسلسل رونا روتے ہیں کہ ہمیں کوئی بری لت پڑی ہوئی ہے‘ کوئی ایسا گناہ جو ہم چھوڑ نہیں پا رہے‘ بار بار اس کو کر بیٹھتے ہیں۔ بڑے وعدے کیے اللہ سے‘ بڑی معافی مانگی‘ مگر پھر سے کر دیا۔ کمزور پڑ گئے۔ نفس کے آگے ہار گئے۔ اب روتے ہیں کہ سارا وقت مایوسی۔۔۔ ڈپریشن۔۔۔ میں تو کسی اچھائی کے قابل نہیں رہا۔ یہ نہیں دیکھیں گے کہ گناہ کے بعد احساس ہونا اور خود کو ٹھیک کرنے کا اور توبہ کرنے کا موقع دیا ہے اللہ نے۔ یہ ہے اللہ کا فضل جس کو اپنے پچھتاووں میں ہم ضائع کر دیتے ہیں۔ پچھتاوا ہونا چاہیے‘ مگر پچھتاوے کا روگ لے کر مایوس ہو جانا ان مواقعوں کی ناقدری ہے اور ہم یہ ناقدری روز کرتے ہیں۔ آخر کب ہم اپنے اردگرد وہ تمام "مواقع" دیکھنے کی آنکھ پیدا کریں گے خود میں جو اللہ نے ہمارے پچھتاووں کے بدلے میں اس کا نعم البدل بنا کے ہمارے سامنے رکھے ہیں۔ آخر کب؟"

وہ سفید فرش پہ قدم آگے بڑھا رہا تھا۔ چہرے پہ ملال سا تھا۔ اردگرد چھائی وحشت ویسی ہی تھی اور طبیعت کو مکدر کررہی تھی۔ پھر مریضوں کی آوازیں، اسپتال کے عملے کا شور سب بڑھتا گیا تو اس نے ہینڈز فری کانوں سے نکال لی۔ مطلوبہ راہداری قریب آچکی تھی۔

اس لڑکے کا نام شہزاد تھا اور وہ بستر پہ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ چہرہ کھل اٹھا۔ سعدی مسکراتا ہوا اس کے سامنے بستر کی پائنتی پہ آبیٹھا۔ وارڈ میں آگے پیچھے لوگوں کا شور اور رش ہر پل بڑھ رہا تھا، ایسے میں جب وہ لڑکا اٹک اٹک کے رک رک کے اس سے مخاطب ہوا تو اس کی بات سننے کے لیے سعدی کو آگے جھکنا پڑا۔ اس کی ماں دوائیاں لینے گئی ہے اور وہ جلد ڈسچارج کردیا جائے گا، یہ بات وہ بدقت سمجھ پایا تھا۔

"وہ لڑکے کون تھے، تمہیں کیوں مار رہے تھے؟"

"وہ اسٹور سے چیزیں چُرا رہے تھے۔۔۔ میں نے۔۔۔ میں نے شاپ کیپر کو بتا دیا تو باہر نکل کے وہ مجھے مارنے لگے۔۔۔" وہ ٹیڑھے ہونٹوں کے ساتھ زور لگا کر بولتا تھا۔ سعدی مسکرا کے سنتا رہا۔ لڑکا بے چینی سے پھر سے گویا ہوا۔

"آپ۔۔۔ ٹی وی والے ہونا۔۔۔ سا۔۔۔ سعدی یوسف؟" سعدی نے اسی اداس مسکراہٹ کے ساتھ سرہلایا۔ وہ جانتا تھا، اب وہ لڑکا اس کا شکریہ ادا کرے گا، کہ اس نے کمزور کی مدد کی، طاقت ور کے مقابلے میں اور۔۔۔

"آپ لوگ۔۔۔ آپ سب۔۔۔ بہت۔۔۔ بے وقوف ہو۔" وہ ہکلا کے بولا تو سعدی کی مسکراہٹ سمٹی۔ پھر یک دم وہ دل کھول کے ہنس دیا اور غور سے اس کم عمر لڑکے کو دیکھا۔ سانولی رنگت اور سیاہ آنکھوں والا شہزاد کافی مضطرب اور بے چین نظر آتا تھا۔

"اچھا۔۔۔ کیوں ہوں میں بے وقوف؟" وہ جواباً زور لگا کے کچھ بولنے لگا تھا، مگر سعدی کی بات جاری تھی۔ "کیونکہ میں امیر اور طاقت ور لوگوں کے خلاف کھڑا ہوا ہوں؟" لڑکے نے نفی میں سرہلایا۔

"یا میں اس ملک کے گلے سڑے عدالتی نظام سے انصاف کی امید وابستہ کیے ہوئے ہوں؟"

"نن۔۔۔ نہیں۔۔۔"

"یا میں چپ کرکے ان سے پیسے لینے والوں میں سے نہیں ہوں یا میں ان کے ڈر سے دبک کر بیٹھ نہیں گیا؟ کیوں شہزاد! تم جیسے نوجوان کو سعدی یوسف بے وقوف کیوں لگتا ہے؟"

"نہیں۔۔۔" مگر وہ اس کو نہیں سن رہا تھا۔

"کیا میں اس لیے بے وقوف ہوں کیونکہ میں ایک بے سود کوشش کررہا ہوں؟ قید میں اپنے پراجیکٹ کے رازان کے حوالے کردیتا، تیس کروڑ لے لیتا اور نئی زندگی شروع کردیتا تو عقل مند ہوتا؟ قصاص مانگ رہا ہوں میں۔ اتنا وقت اور پیسہ برباد کررہا ہوں۔ اس لیے بے وقوف لگتا ہوں نا میں سب کو۔۔۔" اس کے لہجے میں جذباتی سا دکھ ابھر آیا تھا۔

لڑکا جو بار بار بے چینی سے نفی میں سرہلاتا تھا، اب کے پورا زور لگا کے بولا۔

"تم لوگوں نے آپریٹر سے پوچھ گچھ نہیں کی۔" پورا فقرہ بول کے وہ گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ سعدی یوسف بالکل ٹھہر گیا۔

"کیا؟"

"ایئرپورٹ۔۔۔ کنٹرول روم آپریٹر۔۔۔ میری امی ایئرپورٹ پہ کام کرتی ہے۔۔۔ آپریٹر نے بولا تھا کہ اس نے امیر لڑکے کی فوٹیج ڈیلیٹ کردی ہے۔۔۔"

"کون نوشیرواں؟" وہ تیزی سے بولا، مگر آواز دھیمی کرلی۔ "مگر ہم نے ایئرپورٹ کی ساری فوٹیجز چیک کی تھیں، اکیس مئی کی اور اگلے ایک ہفتے کی۔۔۔ نوشیرواں کہیں نہیں تھا۔"

"مگر آپریٹر نے خود بولا کسی کو کہ اس نے فوٹیج مٹائی ہے۔۔۔ فوٹیج میں وہ تمہارے گم ہوجانے کے "بعد" ملک سے جاتا نظر آرہا تھا۔ ایئرپورٹ پہ سب کو پتا ہے یہ بات۔ تم بہت مشہور ہو، مگر تم نے کسی سے پوچھا نہیں۔ خاموشی سے چلے گئے۔"

ٹھنڈی برف کی آبشار تھی جو سعدی یوسف پہ اوپر

سے اگری تھی۔ وہ بے یقینی سے اس کے قریب آیا۔
"تمہارا مطلب ہے کہ ثبوت نہیں ہے' مگر اس ثبوت کو دیکھنے والا گواہ موجود ہے!"
لڑکے نے جھٹ اثبات میں سر ہلایا۔ بالآخر وہ اپنی بات سمجھا پایا تھا۔
"اور تمہاری ماں کو یقین ہے کہ اس نے اس آپہنٹر کو یہ سب کہتے سنا ہے؟"
"ہاں۔ ہاں۔ میری امی جھوٹ نہیں بولتیں۔"
سعدی چند لمحے بس اسے دیکھے گیا۔ اندر بہت سے طوفان برپا تھے۔

☼ ☼ ☼

ہر آبلے پہ درج ہے تفصیل زندگی
مجھ سے نہ پوچھ میرے سفر کی اذیتیں

وارث کی موت کے بعد اس کی آنکھوں پہ چھائی سرخ دھند ابھی ویسی ہی تھی۔ اس روز اس نے زمر کو اپنی واحد گواہ سے ملوانے کے لیے اس کے ہوٹل بلایا تھا جو گواہی دے سکے کہ فارس غازی قتل کے وقت اس کے ساتھ تھا۔ حنین بھی ان کے ہمراہ تھی اور وہ زمر کو وقت اور جگہ بتا کر اب ہوٹل روم میں بیٹھے اس کے منتظر تھے۔ فارس خاموش تھا۔ علیشا خاموش تھی۔ حنین خاموش تھی۔ وہ ایسی خاموشی تھی جس میں ہر شخص اپنے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سب کو خود کو بچانے کی فکر تھی۔ خود غرضی نہیں تھی یہ' بے بس سا سیلف ڈیفنس تھا۔
حنین اپنی جگہ شرمندہ دکھائی دیتی تھی۔ اسے فارس کو اس دن سب سے دور علیشاہ کے پاس لے جانے میں اپنی غلطی نظر آرہی تھی۔ امی جب سے غم سے ذرا نکلی تھیں' اٹھتے بیٹھتے اسے انٹرنیٹ فرینڈز کے نقصان گنوا رہی تھیں۔ زمر اس سے مل لے تو سارا مسئلہ ختم ہوجائے اور سب اس قصے کو بھول بھال جائیں۔
علیشاہ کو اپنی فکر تھی۔ وہ یہاں ہاشم اور اپنے باپ کے دانتوں سے چند نوالے کھینچنے آئی تھی۔ اسے اپنا جائز حصہ چاہیے تھا' مگر ایسے میں وہ ایک قتل کیس کے مشتبہ شخص کی ایلی بائی بن چکی تھی جو اس کے باپ کا رشتے دار تھا۔ وہ جلد سے جلد اس مشکل سے نکلنا چاہتی تھی۔
فارس الگ پریشان تھا۔ زمر پہ غصہ ابھی تک ویسا ہی تھا۔ وہ اپنا کام تیزی سے کیوں نہیں کررہی؟ وہ وارث کے باس سے ملنے کب جائے گی؟ وہ وکلا اور پراسیکیوشن آفس کی اس سست رفتاری سے واقف تھا' مگر اس وقت کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ ہر چیز غصے' فرسٹریشن اور پریشانی میں مبہم دکھائی دیتی تھی۔
جب وہ کافی دیر تک نہیں آئی تو فارس اسے فون کرنے لگا۔ کال بار بار منقطع ہوجاتی۔
"رابطہ ممکن نہیں۔" "اس نمبر سے جواب موصول نہیں ہورہا۔"
اسے اب زمر پہ افسوس ہونے لگا تھا۔ غصے بھرا افسوس۔ وہ کتنی دیر اس کمرے میں دائیں سے بائیں چکر کاٹتا رہا۔ حنین درمیان میں ایک دوبار نیچے شاپس سے پھر بھی آئی (وہ اب بور ہونے لگی تھی۔) مگر زمر نہیں آئی۔
زرتاشہ نے موبائل اٹھایا اور فارس کو کال ملائی۔ ایک گھنٹی بجی' پھر دوسری۔ اس نے فون اٹھالیا۔
"ہاں زرتاشہ! بولو؟"
"آپ کہاں ہیں؟" قدرے ہچکچاہٹ سے اس نے پوچھا۔ ساتھ میں اسے خود پر افسوس ہونے لگا' وہ کیسے کسی اجنبی کی کال پہ اعتبار کرسکتی تھی؟
"میں کام سے آیا ہوا ہوں باہر۔ کوئی کام ہے؟"
"نہیں۔ بس میں آپکا پتا کرنا چاہ رہی تھی۔ آج آپ کو پراسیکیوٹر سے ملوانا تھا اس لڑکی کو' وہ سب ہوگیا خیر سے؟"
"ہاں مگر میڈم ابھی تک نہیں آئیں۔ میں اور حنین علیشاہ کے کمرے میں ان کا انتظار کررہے ہیں۔"
"ہوٹل میں یعنی کہ۔۔۔؟" اس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ فارس نے "بائے" کہہ کر فون بند

کردیا۔ وہ ایک دم کلس کر رہ گئی۔ پھر موبائل رکھ کر ایک نئے ارادے سے اٹھی۔

غصہ افسوس میں بدلا اور افسوس مایوسی میں۔ سب پھر طویل ہوتی گئی اور امید چھوٹی ہوتی گئی۔ اس نے تہیہ کرلیا کہ بس اب وہ پراسیکیوشن آفس کے چکر نہیں لگائے گا۔ ساری عدالتیں گئیں جہنم میں۔ اب جو کرنا ہے وہ خود کرے گا۔ اس نے حنین سے چلنے کو کہا۔ وہ اس وقت اتنے تنے ہوئے تاثر لیے ہوئے تھا کہ حنہ چوں چراں کیے بغیر اس کے ساتھ آگئی۔ علیشا کی جان چھوٹی تو اس نے ان دونوں کے جانے پہ گویا سکھ کا سانس لیا تھا۔

اس نے حنین کو ابھی گھر ڈراپ کیا ہی تھا کہ موبائل پہ کال آنے لگی۔ نمبر غیر شناسا سا تھا۔ فارس نے کال وصول کی۔

دوسری طرف جانے کون تھا' اس نے کبھی رک کے نہیں سوچا۔ پیشہ وارانہ انداز میں اطلاع دی گئی تھی' جسے سن کر اس کا سارا جسم کانپ اٹھا تھا۔ وہ ششدر رہ گیا تھا۔ ساری آوازیں' ساری آہٹیں دم توڑ گئی تھیں۔ وہ کچھ کہہ بھی نہ سکا' بس کار کا رخ موڑ دیا۔ وہ تیز ڈرائیو کررہا تھا' مگر ہر شے سلوموشن میں ہوتی محسوس ہورہی تھی۔ اس کے اردگرد لوگ ہارن بجا بجا نہیں تھک رہے تھے' کار کی کھڑکی سے سر نکال کر اسے گالیاں دے رہے تھے' وہ روڈ کی غلط سمت میں تھا' اسے کچھ پتا نہ تھا۔ کوئی ہوش نہ تھا۔

اس کی بیوی اسپتال میں تھی۔ اس کی بیوی کو گولیاں لگی تھیں اور اس کے سیل فون میں "ہزبینڈ" کے نام محفوظ شدہ نمبر اسپتال والوں یا شاید پولیس والوں نے ڈائل کیا تھا۔ کوئی نام' کوئی رینک' کوئی اور حوالہ نہ تھا۔ صرف ہسبینڈ۔ ایسا رشتہ کہ جیسے سب کو پتا ہو' بس یہی بچانے آئے گا۔

وہ پارکنگ لاٹ میں زنجیریں پھلانگتا' گملے گراتا' بھاگم بھاگ دوڑ رہا تھا۔ اس کی رنگت سفید تھی اور سانس رک رک کے آتی تھی۔ زندگی ایک دفعہ پھر وارث کے ہاسٹل کے کمرے کے باہر جاپہنچی تھی' ایک دروازہ تھا جسے وہ ہاتھ پاؤں مار مار کے کھولنے توڑنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس دروازے کے پار ایک اور بے جان جسم منتظر تھا یا۔۔۔؟ وہ نفی میں سر ہلاتا' راہداری میں آگے بھاگتا جارہا تھا۔ کس سے کیا پوچھا' کون اس کو راستہ بتاتا رہا' وہ نہ سن رہا تھا' نہ دیکھ رہا تھا۔ بس اس سمت میں بھاگ رہا تھا۔

وہ کمرہ ٹھنڈا تھا۔ ایسے جیسے برف کی دیواریں ہوں' پانی کا فرش ہو اور گویا آنکھوں کے سامنے سفید دھند ہو۔ وہ اسے کچھ بتارہے تھے۔ بہت سے لوگ تھے ادھر اور وہ بہت کچھ کہہ رہے تھے۔ فارس کے قدم اب ٹھنڈے پڑگئے تھے۔ ہاتھ کپکپانے لگے تھے۔ وہ اس اسٹریچر کے ساتھ کھڑا تھا جس پہ سفید چادر ڈالی گئی تھی۔ اس کی نظریں چادر پہ جمی تھیں' مگر ہاتھ اٹھا کر چادر ہٹانے کی ہمت نہیں تھی۔ اس کا تذبذب دیکھ کر سامنے کھڑی سفید کوٹ والی عورت نے چادر چہرے سے ہٹائی۔

کسی اپنے کا' مردہ چہرہ پہچاننا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ ایسا سفید' پیلا اور ٹھنڈا ہوتا ہے' ایسے تو وہ سوتے ہوئے بھی نہیں لگا کرتے۔ ایسے آنکھیں تو وہ مذاق میں بھی بند نہیں کرتے۔ ایسے پتھر تو وہ ناراضی میں بھی نہیں بنتے۔ وہ بھی ایسی ہی لگ رہی تھی۔ اس کی پیشانی پہ سیاہ دھبہ تھا۔ سفید دھند کے باعث اسے وہ دھبہ ہی دکھا تھا۔ وہیں اسے گولی لگی تھی۔ اور ایک سینے میں۔ وہ اسپتال آنے سے پہلے ہی مرچکی تھی' پھر بھی (اسے بتایا جارہا تھا) کہ اس کو بچانے کی کوشش کی گئی مگر یہ انسانوں کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ تو کیا انسانوں کے ہاتھ میں صرف جان لینا ہوتا ہے؟ زندگیاں اجاڑنا ہوتا ہے؟ وہ تھکا ہارا زمین پہ بیٹھتا چلا گیا۔ پانی کا فرش ٹھنڈا یخ تھا مگر اس کا اپنا جسم بھی برف بن چکا تھا۔ سر نیہوڑائے' وہ اکڑوں بیٹھا تھا۔ وارث کی موت پہ اسے غصہ محسوس ہوا تھا' زرتاشہ کی موت پہ خوف محسوس ہوتا تھا۔ ایسا ڈر جو پہلے کبھی نہیں لگا تھا۔ اس خوف سے رگوں کا خون سہم کے جم گیا تھا۔ کوئی اسے کہہ رہا تھا کہ اس کے ساتھ دوسری لڑکی بھی

تھی جس کی شناخت پراسیکیوٹر زمر کے طور پہ ہوئی ہے اور اس کی سرجری ہو رہی ہے مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔

کون زمر؟ کیسی زمر؟ اسے اب پروا نہیں رہی تھی۔

پیشانی پہ ہاتھ رکھے وہ سر جھکائے وہاں بیٹھا تھا اور گویا پانی کا فرش دھیرے دھیرے اسے نگل رہا تھا۔ وہ ڈوبتا جا رہا تھا۔ ٹھنڈے پانی سے یخ برف بنتا جا رہا تھا۔ سفید پڑ رہا تھا مگر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

موج سراب دشت وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرہ مثل جوہر تیغ آب دار تھا

وہ رات قطرہ قطرہ پگھل رہی تھی۔ آسمان تاریک ہو چکا تھا' اور تاروں کا جہاں' ماحولیاتی آلودگی کی گہری تہ کی وجہ سے شہر کی سڑکوں سے نظر نہیں آتا تھا۔ ایسے میں ہارون عبید کی رہائش گاہ پہ وہ دونوں خاموشی سے ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ہارون عبید گاہے بگاہے اس پہ نظر ڈال لیتے جو کھانے کے ساتھ بار بار اپنے موبائل کی اسکرین کو دیکھتی تھی۔

ملازم کو جانے کا اشارہ کر کے ہارون اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"آبی۔۔۔" اس نے نہیں سنا۔ سرخ رومال سر پہ اوڑھے ان کی خوب صورت بیٹی' رک کر موبائل اسکرین پہ انگلی پھیرنے لگ گئی تھی۔

"آبی۔" دوبارہ پکارنے پہ وہ چونکی۔ موبائل بجھا کے ان کی طرف سنبھل کے متوجہ ہوئی۔ "سنا ہے مسز کاردار اینٹی سوشل ہوتی جا رہی ہیں۔"

"مجھے نہیں خبر!" اس نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔

"تو خبر رکھا کرو نا۔ مجھے وجہ جاننی ہے۔ تم یوں کرو' کل ہاشم سے ملنے چلی جاؤ۔ اس سے پوچھو کہ۔۔۔"

"بابا۔" وہ اکتا کر بولی تھی۔ "اگر آپ کو مسز کاردار کی حالت زار میں اتنی دلچسپی ہے تو خود چلے جائیں یا اپنے کسی جاسوس کو بھیج دیں۔ مجھ سے یہ کام نہ کروایا کریں۔"

"بیٹا! تمہیں صرف اتنا کرنا کہ ہاشم سے کہنا ہے تم اس کے پرپوزل پر غور کر رہی ہو' لیکن تمہاری کچھ شرائط ہیں۔"

آبی نے چونک کے ان کو دیکھا۔ "کیسی شرائط؟"

"کچھ پیپرز ہیں' تمہیں ان پہ ہاشم کے دستخط لینے ہیں لیکن لینے سے پہلے اسے یقین ہو جائے کہ تم اس کے ساتھ مخلص ہو اور۔۔۔"

آب دار نے زور سے کانٹا پلیٹ میں پٹخا' اور موبائل اٹھا کے کرسی دھکیلتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ غصے اور توہین سے تمتماتے چہرے کے ساتھ ان کو دیکھ کے وہ بس افسوس سے اتنا بولی تھی۔

"میں آپ کی بیٹی ہوں یا کٹھ پتلی' آپ ایک دفعہ بتا کیوں نہیں دیتے؟ اور میں مزید آپ کے ہاتھوں استعمال نہیں ہوں گی۔ مجھے ہاشم سے نہ شادی کرنی ہے نہ اسے کوئی امید دلانی ہے۔ آئندہ میں اس موضوع پہ کوئی بات نہیں سنوں گی۔" برہمی سے بولتی وہ نیپکن پرے پھینکتی ــــــــ نکل کے باہر چلی گئی۔

ہارون اثر لیے بنا اسی طرح سکون سے لقمہ چباتے رہے۔ ان کا ذہن اب اگلا لائحہ عمل سوچ رہا تھا۔

جس وقت وہ کمرے کی طرف جا رہی تھی' اس کا موبائل تھرتھرانے لگا تھا۔ اس نے رک کر اسکرین دیکھی تو چہرے پہ ہیجان سا نمودار ہوا' پھر ہچکچاتے ہوئے فون کان سے لگایا۔

"ہاشم کاردار!" آج پورے نام سے پکارا۔

"ریڈ۔۔۔" وہ جیسے زخمی سا مسکرایا تھا۔ "مل سکتی ہو؟"

"کیوں؟ خیریت؟"

"مل کے بتاؤں گا۔" انداز میں عجیب سی دھونس تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ احتجاج کرتی' وہ لائن کاٹ چکا تھا۔ وہ متذبذب سی کھڑی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

چلتی ہے اب تو سانس بھی اس احتیاط سے

جیسے گزر رہی ہو کسی پل صراط سے

موڑ جال پہ۔ رات کا اندھیرا پھیلا تھا۔ زمر کے کمرے میں آؤ تو وہ صوفے کے ایک کنارے پہ بیٹھی اپنے موبائل پہ مصروف تھی۔ فارس دوسرے کنارے پہ بیٹھا اپنے فون پر مصروف تھا۔ مصروف سی خاموشی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ تب ہی دروازہ زور سے بجا تو دونوں چونکے۔ زمر تیزی سے اٹھی اور دروازہ کھولا۔ سامنے سعدی کھڑا تھا' ہانپتا کانپتا' جیسے بھاگ کے آیا ہو۔

"فوٹیج تھی۔ نوشیرواں کی فوٹیج۔"

"سعدی! آرام سے بیٹھو' پانی پیو۔" وہ اسے کہنی سے تھامے اندر لائی جس کا چہرہ اور بال پسینے سے تر تھے۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" فارس اسے یوں آتے دیکھ کے حیرت سے اٹھا۔

"نوشیرواں کی فوٹیج ایئرپورٹ سیکورٹی فورس کے پاس تھی' جس میں وہ 22 مئی کی صبح دبئی کے لیے بورڈنگ کرتا دکھائی دے رہا ہے۔" وہ بے چین سا صوفے کے کنارے بیٹھا۔

"ایسی کوئی فوٹیج نہیں ہے' ہم نے سب پتا کرایا تھا۔"

"فارس ٹھیک کہہ رہا ہے' ایسی کوئی فوٹیج نہیں ہے۔ ہوتی تو ہمیں مل جاتی۔"

"ایئرپورٹ پہ ملازم ایک خاتون سے بات ہوئی ہے میری۔ ان کا کہنا ہے کہ فوٹیج آپریٹر نے مٹادی تھی جب ٹرائل شروع ہوا تھا۔۔۔" وہ پھولی سانس کے دوران سب کچھ کہتا گیا۔

"مطلب تم پی ایم ڈی سی والے کلرک کے پیچھے نہیں گئے۔" فارس نے اسے برہمی سے دیکھا تو جواباً سعدی نے صرف سرخ آنکھوں سے اسے گھورا۔

"کتنا اچھا ہو کہ آپ اس بات پہ فوکس کریں کہ اب ہمیں وہ فوٹیج کیسے نکلوانی ہے۔"

"چوری کروا سکتا ہوں میں' مگر پھر۔۔۔" زمر کو دیکھا تو اس نے جھٹ نفی میں سر ہلایا۔

"چوری کی فوٹیج کورٹ میں قابل قبول نہیں ہوگی فارس۔ صرف وہی فوٹیج قابل قبول ہوگی جو ایئرپورٹ سیکورٹی فورس خود ہمارے حوالے کرے۔ قانونی طور پہ۔ اور اگر وہ ڈیلیٹ کر چکا ہے تو نہیں ملے گی۔"

"تو اس آپریٹر کو گواہ کے طور پہ بلائیں۔" سعدی نے بے چینی سے بات کاٹی۔

"وہ تو ہو جائے گا' اور عدالت کہے گی اگلی پیشی پہ آپریٹر کو حاضر کرو۔ مگر ہاشم کو چند دن مل جائیں گے اور وہ گواہ کو غائب کرادے گا یا خاموش کرادے گا۔"

فارس ہلکا سا کھنکھارا۔ "جس شخص نے ہاشم سے پیسے کھا کے فوٹیج مٹائی ہے' وہ ہمارے حق میں گواہی دے گا ہی کیوں؟"

"تو اب ہم کیا کریں؟" وہ ان دونوں سے پوچھ رہی تھی اور جواباً وہ دونوں اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کسی کے پاس جواب نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

مجھ سے کسی کو کام کیا' میرا کہیں قیام کیا
میرا سفر ہے در وطن' میرا وطن ہے در سفر

قتل سے پانچ دن قبل

وہ صبح بارش سے نہائی ہوئی تھی۔ قصر کاردار کا سارا سبزہ میل کچیل سے پاک نکھرا اور دھلا دھلایا لگ رہا تھا۔ لاؤنج میں ملازم معمول کی صفائی کر رہے تھے۔ فیونا جواہرات کے کمرے کے باہر کھڑی حکم چلا رہی تھی۔ اب وہ نہ میری سے الجھتی تھی' نہ برے موڈ میں رہتی تھی۔ بس مسکراتی رہتی تھی۔

جواہرات اپنے کمرے میں سست سی' آرام دہ کرسی پہ بیٹھی اپنا فون دیکھ رہی تھی۔ بال کیچر میں باندھ رکھے تھے' اور چہرے پہ بے زاری تھی۔ دفعتاً دروازہ کھٹکھٹا کر فیونا نے اندر جھانکا۔ جواہرات نے اکتائی ہوئی نظر اٹھائی۔

"میری اجازت کا انتظار کیا کرو۔"

"سوری مسز کاردار! مگر مسز رفیع کا ملازم آیا ہے' آپ کا ڈریس لے کر۔ وہ آپ ہی کا ڈریس ہے نا؟"

احتیاطاً" پوچھا۔

جواہرات چونکی پھر اثبات میں سر ہلایا۔ "اسے اندر بھیجو۔"

"گارڈز اس کو چیک کرلیں، پھر بھیجتے ہیں۔" ایک مسکراہٹ کے ساتھ فینونا غائب ہوگئی۔ وہ صبر کے گھونٹ بھر کے رہ گئی۔

چند لمحے بعد مسز رفیع کا ملازم ایک کھلا ہوا پیکٹ اس کے سامنے میز پہ رکھ رہا تھا۔ (پیکٹ گارڈز نے کھول کے چیک کیا تھا۔) البتہ اس وقت کمرے میں صرف فینونا تھی۔ ایسے میں جب مسز رفیع کے ملازم نے جھک کے پیکٹ میز پہ رکھا تو جواہرات نے دیکھا اس نے پیکٹ تلے کوئی شے بھی رکھ دی تھی۔ ایک گہری نظر اس پہ ڈال کے وہ سیدھا ہوا اور ادب سے باہر نکل گیا۔

فینونا کے جاتے ہی جواہرات نے کمرے کا دروازہ مقفل کیا اور پیکٹ ہٹایا۔ نیچے چھوٹا سا سیاہ پیکٹ رکھا تھا۔ اس نے وہ جلدی جلدی کھولا۔ اندر ایک موبائل تھا۔ اس نے اسکرین آن کی۔ اسی پل کال آنے لگی۔

"احمر۔۔۔ یہ کیا طریقہ تھا موبائل بھیجنے کا؟ اگر گارڈز چیک کرلیتے تو؟"

"تو میرا آدمی کہتا کہ یہ اس کا موبائل ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ کم از کم آپ سے رابطے کا کوئی ذریعہ تو ملا۔" وہ دوسری طرف اطمینان کی سانس بھر کے بولا تھا۔

"خیر۔۔۔ یہ صحیح کیا تم نے۔ میں تو بالکل قید ہو کر رہ گئی ہوں۔" وہ واپس پرپیسار کے صوفے پہ بیٹھی اور تلخی سے فون میں بولے گئی۔ "میری ہر حرکت پہ نظر ہے ان دو ٹکے کے ملازموں کی۔"

"کیا کوئی ایک بھی ملازم آپ کا وفادار نہیں ہے۔"

"تم ہی ہو۔ باقی یہاں تو یوں لگتا ہے کہ سب مجھ سے کوئی پرانا انتقام لے رہے ہیں۔ خیر تم بتاؤ، میرے کام کا کیا بنا۔"

"ابھی تک نہیں ہو پایا۔" احمر مایوسی سے کہہ رہا تھا۔ "مگر آپ بے فکر رہیں۔ میں جلد کردوں گا۔"

جواہرات چونکی۔

"ابھی تک ہو جانا چاہیے تھا۔ کہیں تم میری ساری رقم لے کر فرار ہونے کا تو نہیں سوچ رہے۔"

"توبہ کریں مسز کاردار۔" وہ بُرا مان کے بولا تھا۔ "میں آپ کا وفادار ہوں۔ آپ نے مجھے نوکری دی، مجھے عزت دی، میرے لیے ایک مضبوط اور پرعزم Mentor (سرپرست) کا کردار ادا کیا، مجھے اتنا کچھ سکھایا اور آپ کو لگتا ہے کہ میں اتنا احسان فراموش، گھٹیا اور کمینہ ہوں کہ آپ کی دولت اور زیورات لے کر بھاگ جاؤں گا؟" وہ اب افسوس سے کہہ رہا تھا۔

"مجھ پہ اعتبار کیا ہے تو پورا کریں۔ مجھے وقت دیں اور بے فکر ہو جائیں۔ آپ کی ساری چیزیں بحفاظت آپ تک پہنچ جائیں گی۔ وہ آپ کی امانت ہیں، اور ان کو آپ تک پہنچانے کے لیے مجھے اپنی جان بھی دینی پڑی تو دے دوں گا، مگر اپنی کمٹمنٹ نہیں توڑوں گا۔"

آخر میں وہ جذباتی ہو گیا تھا۔ جواہرات کے ماتھے کی سلوٹیں ڈھیلی ہوتی گئیں۔ وہ نرمی سے مسکرائی۔

"مجھے تم پہ فخر ہے احمر، کیونکہ تم میرا انتخاب تھے۔ اگر قسمت مجھے مہلت دیتی تو میں آنے والے برسوں میں تمہیں تراشتی، تمہیں سکھاتی اور تمہیں ایک بہترین سیکورٹی آفیسر بنادیتی۔ خیر ایک دفعہ یہ ٹرائل گزر جائے تو میں تمہیں واپس لے آؤں گی۔"

اور اپنے اپارٹمنٹ کے لاؤنج میں بیٹھا احمر سر ہلاتا ہوا سن رہا تھا۔ ایک ہاتھ سے فون کان پہ لگا رکھا تھا اور دوسرے سے وہ میز پہ رکھے زیورات اٹھا اٹھا کے دیکھ رہا تھا۔ پلاٹینم اور ہیروں سے جڑے زیورات کی چمک اس کی آنکھیں خیرہ کررہی تھی۔

"آپ بے فکر رہیں۔ میں بہت جلد آپ کے زیورات اور نقدی لے آؤں گا، اور آپ کی امانت آپ کے حوالے کرکے سرخرو ہو جاؤں گا۔"

فون بند کرکے وہ ایک دفعہ پھر سے ان کو ٹٹول کے دیکھنے لگا۔ پھر احتیاط سے میز پہ رکھے سیاہ بیگ میں بھرنے لگا۔ بیگ میں پہلے سے چند نوٹوں کی گڈیاں، چیک بکس، ٹریولز چیکس رکھے دکھائی دے رہے تھے۔ اور ان کے اوپر وہ پلاسٹک میں سیل کرکے زیور

ڈول رہا تھا۔
تب ہی گھنٹی بجی۔ وہ چونکا، پھر تیزی سے بیگ میں سارا سامان بھرنے لگا۔ دروازہ کھٹکھٹایا جانے لگا۔ احمر کے ہاتھوں کی رفتار میں مزید تیزی آگئی۔ پھر لاک کھلنے کی آواز آئی۔ اس نے بیگ کی زپ بند کرکے جلدی سے اسے صوفے تلے دھکیلا اور فق چہرہ اٹھایا تو۔۔۔
سامنے دروازہ کھول کے فارس اندر آیا تھا۔ احمر کی اٹکی سانس بحال ہوئی۔
"تم۔۔۔" پھر غصہ آنے لگا۔ "کسی مہذب آدمی کے گھر اس طرح تالا توڑ کے داخل نہیں ہوتے۔ کوئی شرم ہوتی ہے، کوئی حیا ہوتی ہے، مگر تمہیں کیا پتا کہ وہ کیا ہوتی ہے۔"
فارس حسب معمول ماتھے پہ بل لیے، گرے شرٹ میں ملبوس، آستینیں چڑھائے چلا آرہا تھا۔ اس کے سامنے آکر رکا اور سنہری آنکھیں سکیڑ کے اسے دیکھا۔
"رنگ کیوں اڑا ہوا ہے؟" پھر اندرونی کمرے کے دروازے کو دیکھا۔ "اندر کوئی ہے؟"
"نہیں یار۔ آؤ بیٹھو۔" اس نے جھلا کے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ خود دانستہ کھڑا رہا۔ جس صوفے کے آگے کھڑا تھا اسی کے نیچے سیاہ بیگ رکھا تھا۔
"اتنی صبح صبح کون سی آفت آن پڑی تھی؟" برے موڈ سے کہتے ہوئے اب خود بھی بیٹھا، کیونکہ فارس سامنے بیٹھ چکا تھا اور ٹانگ پہ ٹانگ جمالی تھی۔
"پی ایم ڈی سی کا ریکارڈ حاصل کرتا ہے، ایئرپورٹ پہ ایک گواہ ڈھونڈتا ہے، رات سے میسج کر رہا ہوں تمہیں۔ کہاں ہو تم؟" فارس خفگی سے کہتا بار بار مشکوک انداز میں اس کو سر سے پیر تک دیکھتا تھا۔
"میں نے سعدی کو موقع دیا تھا۔ اس نے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اب میں کچھ نہیں کرسکتا۔" وہ ہاتھ مسلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ فارس کچھ لمحے سوچتا رہا، پھر ایک دم جھک کے نیچے سے کچھ اٹھایا اور احمر کا سانس رک گیا۔ وہ ایک سبز پاسپورٹ تھا۔
"تم کہیں جارہے ہو، سلطان بنگش؟" پاسپورٹ کھولتے ہوئے اس نے نام پڑھا، پھر ابرو سے احمر کے صوفے تلے جھلکتے بیگ کی طرف اشارہ کیا، جو اسے جانے کیسے نظر آگیا تھا۔ احمر نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔ "شہر سے باہر جارہا ہوں، کچھ دن کے لیے۔"
"تو پاسپورٹ کس لیے؟"
"تم میری ماں ہو؟"
فارس نے پاسپورٹ میز پہ ڈال دیا اور سوچتی نظروں سے اسے دیکھا۔
"تو احمر شفیع کی شناخت کا یہ اختتام تھا؟ تم کوئی لمبا ہاتھ مار کے بھاگ رہے ہو، ہے نا؟" پھر وہ مسکرایا۔ "اس بیگ میں ہوگا کسی کا لوٹا ہوا مال، ہے نا؟"
"دیکھو، میں تم لوگوں کی جتنی مدد کرسکتا تھا میں نے کی۔ لیکن اب مزید یہاں ٹھہرنا میرے مفاد میں نہیں۔ مجھے اپنا بھی سوچنا ہوگا اور۔۔۔"
"اسٹاپ اِٹ! ہم جس دن دوست بنے تھے میں اسی دن سے جانتا تھا کہ تم ایک پیدائشی فراڈ ہو اور میں نے تمہیں تمہاری ان کوالٹیز کے ساتھ قبول کیا تھا، اسی لیے میرا خیال ہے تم درست فیصلہ کر رہے ہو۔" وہ سادگی سے کہہ رہا تھا۔ نہ کوئی ناراضی، نہ کوئی شکوہ۔ احمر کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑے۔
"تم نے اس شہر میں جتنے لوگوں کو مسز کاردار کی وجہ سے خفا کرلیا ہے، اس لحاظ سے تو تمہیں بہت پہلے یہاں سے چلے جانا چاہیے تھا۔"
"سوری۔۔۔ میں مزید تم لوگوں کے لیے کچھ نہیں کرسکا۔" وہ ہلکے سے افسوس سے بولا۔ فارس اداسی سے مسکرایا۔
"آدمی تم انتہائی گھٹیا ہو، مگر دوست اچھے ہو۔ جاؤ معاف کیا۔" اور وہ دونوں ہنس پڑے تھے۔

☆ ☆ ☆

تم سے پہلے جو شخص یہاں تخت نشین تھا
اس کو بھی اپنے خدا ہونے پہ اتنا ہی یقین تھا

نوڈلی ایور آفٹر کی چھت کے عین اوپر آسمان پہ

سورج سنہرے انگارے کی مانند دہک رہا تھا۔ بارش کے پانی کو اس نے سکھا دیا تھا۔ بالائی منزل کے خالی ہال کے کونے میں زمر اپنی کرسی پہ بیٹھی ایک فائل کے مطالعے میں مصروف تھی۔ سامنے میز کے ساتھ لینڈ لائن کا ریسیور اٹھائے کھڑا جنید دوسری طرف جاتی گھنٹی سن رہا تھا۔ پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"مس حلیمہ سیل نہیں اٹھا رہیں۔"

"گھر پہ فون کیا؟" زمر سر جھکائے فائل پہ کچھ لکھتے ہوئے بولی۔

"جی۔۔۔ انہوں نے بات کرنے سے انکار کر دیا۔ آفس فون کیا تو میری آواز سے آپ کا نام سن کے رکھ دیا۔ اب سیل ٹرائی کر رہا ہوں۔"

"اور جو خط میں نے اسے بھیجا تھا' اس کی وصولی کی رسید آ گئی؟"

"جی۔۔۔ آپ کی دراز میں رکھ دی تھی۔" جنید فون رکھ کے بتانے لگا۔

"تھینک یو جنید۔" پھر اس نے سر جھکائے کام کرتے اپنا موبائل اس کی طرف بڑھایا۔ "اس سے ٹرائی کریں۔"

جنید اب موبائل پہ نمبر ملانے لگا۔ جیسے ہی دوسری طرف سے ہیلو سنائی دیا اس نے جلدی سے فون زمر کی طرف بڑھایا۔ زمر نے اسی مصروف انداز میں کان سے لگا لیا۔

"حلیمہ! میں زمر یوسف بات کر رہی ہوں' آپ چند لمحے کے لیے میری بات سن لیں گی؟" اب وہ بولتے ہوئے کاغذ پہ لکیر لگا رہی تھی۔

"میں آپ کے اسسٹنٹ کو بتا چکی ہوں کہ مجھے آپ لوگوں سے بات نہیں کرنی' میں اپنا بیان صرف عدالت میں دوں گی۔"

"حلیمہ! مجھے آپ کو ڈرانا دھمکانا نہیں ہے' نہ ہی آپ کو اپنا بیان بدلنے پہ مجبور کرنا ہے' مجھے صرف آپ سے 21 مئی کی دوپہر کے متعلق چند سوالات پوچھنے ہیں' تاکہ میں کیس کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکوں۔ کیا آپ مجھے تھوڑا سا وقت دے سکتی ہیں۔"

"نہیں' مجھے کوئی بات نہیں کرنی' آپ قانوناً مجھے مجبور نہیں کر سکتیں۔" وہ درشتی سے بولی اور فون رکھ دیا۔

زمر نے اسی مصروف انداز میں موبائل رکھ دیا اور اپنا کام کرنے لگی جیسے اس سے زیادہ اسے اس معاملے میں دلچسپی نہ ہو۔

چند میل دور واقع اس بلند عمارت کے ٹاپ فلور کے کارنر آفس میں حلیمہ' ہاشم کے سامنے بیٹھی تھی اور جھرجھری لے کر اپنا موبائل میز پہ رکھ رہی تھی اور ہاشم مسکرا کے اسے دیکھ رہا تھا۔

کونے میں ایک اونچی میز پہ وہ بڑا سا ایکوریم مصنوعی روشنیوں میں چمکتا دمکتا دکھائی دے رہا تھا۔ خوب صورت رنگ برنگی مچھلیاں اندر تیر رہی تھیں۔ کھیل رہی تھیں۔ ڈبکیاں لگا رہی تھیں۔

"سر۔۔۔ پھر اب؟"

"اب کچھ بھی نہیں۔ تمہیں اس سے بات نہیں کرنی اور اپنی تیاری مکمل رکھنی ہے۔ اب جو کہنا ہے عدالت میں کہنا ہے۔" وہ ٹیک لگا کے بیٹھا تھا اور کوٹ پیچھے اسٹینڈ پہ لٹکا رکھا تھا۔ بنے ہوئے بال' خوشبو میں بسا وجود' وہ مکمل تر و تازہ اور ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ شیرو کی پریس کانفرنس سے ہونے والے مالی نقصان کا شائبہ تک چہرے پہ نہیں تھا۔

"تیاری تو آپ نے مجھے کرا دی ہے۔ 21 مئی کو سعدی یوسف ادھر نہیں آیا تھا اور اس سے پہلے جو میں نے اس کو کالز کی تھیں' وہ بھی ذاتی وجہ سے کی تھیں۔" وہ پراعتماد تھی۔

"میں نے تمہیں ایگزامینیشن ان چیف کی مشق کرائی ہے۔ اس کے بعد کراس (جرح) ہو گی۔ وہ کراس کے ذریعے تمہیں جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرے گی۔" وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

"اور پھر میں کیا کروں گی سر؟"

"بے وقوف وکیل وہ ہوتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ کراس کے دوران کا گواہ مخالف وکیل کو ہرا دے اور اسے خود کو جھوٹا ثابت کرنے ہی نہ دے مگر ایسا نہیں

ہوتا۔ ہرانے والی باتیں ڈائریکٹ اگزامینیشن میں کہنی ہوتی ہیں۔ کراس میں صرف سروائیو کرنا ہوتا ہے۔ دفاع کرنا ہوتا ہے۔ کم سے کم نقصان کرنا ہوتا ہے اپنا۔"

"اور میں اس کے سوالوں کا مقابلہ کیسے کروں گی؟"

اس کی آواز میں فکرمندی در آئی۔ وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"اور اچھا وکیل وہ ہوتا ہے جو اپنا کیس تو تیار کرے مگر ساتھ میں مخالف کا کیس بھی تیار کرے۔ کبھی کبھی میں اپنے مخالف کے لیے جتنے اچھے دلائل اور نقطے ڈھونڈ کر لکھتا ہوں، کورٹ روم میں وہ اتنے اچھے نقطے پیش نہیں کرتے۔ خیر۔ اب میں زمر کی طرف سے پوچھے جانے والے سوالات بتاتا ہوں تمہیں۔" وہ اب میز کے کونے پہ آبیٹھا تھا اور سامنے بیٹھی توجہ سے سنتی حلیمہ سے کہہ رہا تھا۔

"مس حلیمہ! کیا یہ درست نہیں کہ آپ نے اس تاریخ کو اس وقت سعدی یوسف کو کال کی تھی؟"

"کیا یہ درست نہیں ہے کہ آپ پچھلے کئی سال سے اس فرم میں ملازمت کر رہی ہیں اور ہمیشہ اپنے مالک کا ساتھ دیتی آئی ہیں اور اب بھی اس کے لیے جھوٹ بول رہی ہیں۔ ایسے سوالات پہ میں اعتراض کروں گا، تو وہ ٹون بدل کے یہی سوال مختلف انداز میں پوچھے گی۔ کیا یہ درست نہیں کہ آپ نے ہاشم کاردار کی کمپنی سے قرضہ لے رکھا ہے جو قسطوں میں ادا کرنا ہے اور آپ ان کے احسان تلے دبی ہوئی ہیں؟ کیا یہ درست نہیں ہے کہ آپ رات دیر تک آفس میں کام کرتی ہیں اور آپ کی اپنے باس سے کافی فرینک نیس ہے؟ کیا یہ درست نہیں ہے کہ آپ کے اپنے باس سے تعلقات ہیں؟"

"کیا وہ اس طرح کا الزام بھی لگا سکتی ہیں؟" اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"عدالت میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ اسے تمہیں جھوٹا ثابت کرنا ہے، اس لیے وہ سخت سے سخت زبان استعمال کرے گی، تلخ انداز اپنائے گی، تیز تیز سوالوں کی بوچھاڑ کر کے تمہیں کنفیوز کردے گی۔ اس لیے اب میں تمہیں ان سوالوں کے جوابات کی مشق کروانے لگا ہوں۔ اوکے!" وہ اسے نرمی سے سمجھا رہا تھا۔

"شیور سر!" حلیمہ ذرا ٹھہری پھر آنکھیں اٹھا کے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "سر! ایک بات پوچھوں؟"

"یہی کہ میں نے اور شیرو نے یہ سب واقعی کیا ہے یا نہیں؟"

حلیمہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ہاں۔ میں نے یہ کیا ہے اور مجھے دس بار موقع ملے تو میں دس بار یہ ہی کروں گا۔ اب ہم پریپ کرلیں؟"

حلیمہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔ وہ جھٹ اثبات میں سر ہلا کے "یس سر!" بولی تھی۔ وہ اب کاغذ اٹھا کے سوالات پھر سے دہرانے لگا تھا۔ چہرہ سپاٹ اور مطمئن تھا۔

واپس فوڈلی ایور آفٹر کی بالائی منزل پہ آؤ تو زمر اسی انداز میں بیٹھی نوٹ پیڈ پہ سوالات لکھے جارہی تھی۔ سامنے کھڑے جنید نے بے چینی سے پوچھا۔

"ان کی سیکریٹری تو ملنے پہ راضی ہی نہیں ہوئی، اب آپ اس کا بیان اپنے حق میں کیسے کروائیں گی؟"

"مجھے جرح کے دوران گواہ کو سوالات سے مار دینے کا فن آتا ہے، جنید! آپ اپنا کام کیجیے۔" وہ اب بھی سر جھکائے لکھے جارہی تھی۔

☆ ☆ ☆

ذرا سی دیر کا ہے یہ عروج مال و منال
ابھی سے ذہن میں سب زاویے زوال کے رکھ

قتل سے تین دن قبل

قصرِ کاردار کا سبزہ زار اس شام برقی قمقموں اور روشنیوں سے منور تھا۔ اونچے درختوں کے گرد قمقمے لپیٹ کر ان کو خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ مرکزی اسٹیج پہ فنڈ ریزنگ تقریب کے بعد اب گلوکار اپنے ساتھیوں سمیت نیچے بیٹھا غزل گا رہا تھا۔ ایسے میں جواہرات یہاں سے وہاں ٹہلتی، مسکرا مسکرا کے

مہمانوں سے چند پل ٹھہر کے گپ شپ کر رہی تھی۔

سیاہ جھلملاتی نگینوں سے مزین ساڑھی میں وہ بے حد تر و تازہ اور خوب صورت دکھائی دے رہی تھی اور اس اچھے موڈ کو برقرار رکھنے کے لیے وہ قریب ٹہلتے دونوں گارڈز کو دیکھنے سے خود کو باز رکھے ہوئے تھی۔

محفل موسیقی ابھی جاری و ساری تھی جب جواہرات برآمدے کے زینے عبور کرکے اندر جاتی دکھائی دی۔ جیسے کوئی بھولی چیز اٹھانے جا رہی ہو۔

لاؤنج کا دروازہ کھول کے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ ٹھٹک گئی۔ وہاں چند ہی لوگ تھے جو یا تو موبائل پہ مصروف صوفوں پہ نیم دراز تھے' یا ٹی وی دیکھ رہے تھے' مگر دیوار کے سامنے کھڑی عورت کو دیکھ کر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی خیز لہر دوڑ گئی۔ قدم ڈھیلے پڑ گئے۔ اس نے اس کو نہیں بلایا تھا تو پھر......؟

وہ سفید چادر سر پہ جمائے' اس کی طرف پشت کیے کھڑی' دیوار پہ نصب فوٹو فریمز دیکھ رہی تھی۔ فریمز ڈیجیٹل تھے' ان کے اندر تصاویر ہیری پوٹر کی دنیا کی طرح چل پھر رہی تھیں۔ چند سیکنڈز کے وڈیو کلپس اور پھر سلائیڈ شو۔ دس منٹ کھڑے ہو کر دیکھو تو ہاشم اور شیرو کی ساری زندگی کی تصویری کہانی سامنے آجاتی تھی۔ صاحب زادی صاحبہ بھی وہی دیکھ رہی تھیں۔

آہٹ پہ پلٹیں۔ گوری رنگت اور گہری آنکھیں۔ مسکرا کے جواہرات کو دیکھا۔

جواہرات سست روی سے قریب آئی۔

"خوشی ہوئی آپ کو دیکھ کر۔ اگر آنا چاہتی تھیں تو مجھ سے کہہ دیا ہوتا۔ میں دعوت نامہ بھیج دیتی۔" جبری مسکراہٹ کے ساتھ کہتی وہ اس کے عین سامنے آ کھڑی ہوئی۔ چادر والی عورت ذرا سا مسکرائی۔ "لوگ اب مجھے خوشی سے دعوتوں میں نہیں بلاتے' جواہرات! جب سے تمہارے اس پالتو نے میری زندگی کی جھوٹی کہانیاں زبان زد عام کی ہیں' لوگ مجھے پسند نہیں کرتے۔"

"میں سمجھی نہیں۔ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" جواہرات حیرت سے بولی تھی۔

"تمہیں نہیں پتا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں؟"

"آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ کے اس اسکینڈل سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

عورت نے ایک گہری نظر اس پہ ڈالی' پھر ٹھنڈی سانس بھر کے مڑ گئی اور گردن ذرا اٹھا کے اوپر تک پھیلے فوٹو دیکھنے لگی۔

"تمہارے دونوں بیٹے کتنے خوب صورت ہیں' ماشاء اللہ...... ایک دنیا تم پہ رشک کرتی تھی' حسد کرتی تھی' مگر پھر اسی دنیا نے دیکھا تمہارے بیٹے نے تمہیں کاروبار سے بے دخل کر دیا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ تلملا کر بولی' مگر عورت بولے جا رہی تھی۔ "اور جب عدالت میں ایک چھوٹی سی لڑکی تمہاری عزت کا تماشا بنا کے چلی گئی تو مائیک تمہارے چہرے کے آگے کرتے رپورٹرز کے سامنے تمہارا کوئی ایک بیٹا بھی ڈھال بن کے نہیں آیا۔"

"بہت ہو گیا' آپ یہاں سے جا سکتی ہیں۔" وہ دبا دبا سا غرائی تھی۔

"ٹھہرنے آئی بھی نہیں تھی میں......" وہ اب پوری اس طرف گھومی اور جواہرات کی سلگتی آنکھوں میں جھانکا۔ "صرف یہ بتانے آئی تھی کہ مجھے اسی وقت کا انتظار تھا۔ کبھی لگتا تھا اس کو آنے میں برسوں لگیں گے' مگر یوسفز کا شکریہ' یہ تو بہت جلد آگیا۔"

"گیٹ آؤٹ!" وہ لال بھبوکا چہرہ لیے دروازے کی طرف بازو لمبا کر کے بولی۔

"جواہرات!" سفید چادر والی عورت دو قدم قریب آئی اور تاسف سے اس کا چہرہ دیکھا۔ "آج کل تمہاری تباہی میں سب اپنا اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔ تمہارے بیٹے' یوسفز' ہارون عبید' سب سیر ہو کر اپنا حصہ ڈال لیں' تب بھی میرا حصہ پورا نہیں ہوگا۔ تمہاری آنکھوں میں دیکھ کے بس اتنا کہنا تھا کہ آخری حصہ میں ڈالوں گی اور تم اسے یاد رکھو گی۔"

پھر وہ اس کے قریب سے گزرتی ہوئی باہر نکل کے چلی گئی اور جواہرات غصے اور بے بسی سے کانپتی

کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ باہر سے اونچے سروں میں بجتی موسیقی کی آوازیں ہنوز سنائی دے رہی تھیں۔

لاؤنج کے مہمانوں کو وہیں چھوڑ کے بغلی راہ داری میں آگے آؤ تو سامنے زینے تھے جو نیچے جاتے تھے۔ ان کو پھلانگ کر اترتے جاؤ گے تو آگے ایک طویل راہ داری تھی۔ دونوں اطراف میں کھلے دروازے تھے جو ملازموں کے کمروں میں کھلتے تھے۔ مزید آگے آؤ تو آخر میں کچن تھا۔ قصر کی پشت پہ سبزہ زار نشیب میں تھا، اس لیے کہ کچن بیسمنٹ میں بنا لگتا تھا، مگر اس کی پچھلی طرف سبزہ زار میں ہی کھلتی تھی۔

کچن کے کھلے دروازے سے اندر جھانکو تو وہاں ملازم ندارد تھے۔ صرف دو نفوس موجود تھے۔ ایک ہاشم جو کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا تھا اور بلینڈر کے جگ میں کٹے ہوئے پھل کین سے انڈیل رہا تھا۔ شرٹ کی آستینیں پیچھے کو موڑ رکھی تھیں اور کوٹ سامنے کرسی کی پشت پہ ڈال رکھا تھا اور دوسری آبدار جو کاؤنٹر کے اس طرف اونچے اسٹول پہ بیٹھی اسے سکون سے دیکھ رہی تھی۔ نہ کوئی ڈر تھا نہ کوئی خوف۔ عادتاً وہ کان میں لٹکتے آویزے کو دو انگلیوں سے مسل بھی رہی تھی۔ آویزے سبز تھے، اس کے لباس اور آنکھوں کی طرح اور سرخ رومال ماتھے سے اوپر بندھا تھا۔ نظریں ہاشم کی پشت پہ جمی تھیں۔

"نہیں چاہتا تھا ہم ڈنر کریں، مگر تم اسی پارٹی میں ڈنر ایڈجسٹ کرنا چاہتی ہو تو میں یہی کر سکتا ہوں۔"

وہ اب بلینڈر کا ڈھکن بند کر کے، اس پہ ہاتھ رکھے بٹن آن کر رہا تھا۔ یک دم زوں کی آواز آئی تو آبدار کچھ کہتے کہتے رکی۔ پھر بلینڈر رکا تو وہ بولی۔

"مجھے نہیں پتا تھا، کہ بم ریپر اتنا ماہر بار ٹینڈر بھی ہے۔"

ہاشم دھیرے سے ہنسا۔ زخمی سی ہنسی۔

"زیادہ نہیں، مگر تھوڑا بہت آتا ہے۔ اب تو لگتا ہے کہ جو سیکھا تھا، وہ بھی بھول گیا۔" آواز میں آنچ تھی۔

"تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟" آبی کی آواز ذرا مدھم ہوئی۔ نظریں سامنے کھڑے ہاشم پہ جمی تھیں۔ وہ چونکی تھی، مگر خوف زدہ نہیں تھی۔

"جب میں چھوٹا تھا تو مجھے ایک بری عادت پڑ گئی تھی۔" وہ اب اوپر کے اسٹینڈ میں الٹے لٹکے گلاس اتار کے کاؤنٹر پر رکھ رہا تھا۔ نظریں آبی کے بجائے اپنے کام پہ تھیں۔ "مجھے جب کوئی کھلونا پسند آتا، کوئی کتاب اچھی لگتی، میں اسے لینے کی ضد کرتا، روتا، جھگڑتا، بس کسی طرح وہ مجھے مل جائے۔ ڈیڈ کو یہ بات سخت ناپسند تھی۔ کچھ عرصہ انہوں نے برداشت کیا، پھر ایک دن انہوں نے مجھ سے میری ساری جمع کی ہوئی کوائن کلیکشن لے لی۔"

اب وہ گردن جھکائے جگ سے گلاسوں میں رس انڈیل رہا تھا۔

"اور کہا کہ محبوب شے کو چھین کر لینے، یا چرانے سے چیز تو مل جائے گی، مگر محبت ختم ہو جائے گی۔ جن سے محبت ہوتی ہے ان کو مجبور نہیں کیا جاتا۔ ان کو جیتا جاتا ہے محبت سے لگن سے انہوں نے وہ البم کہیں چھپا دیا تھا، مجھے چند پہیلیاں بتائیں، یاد نہیں کیا تھیں، مگر میں نے پھر اس کو خود ڈھونڈا، شاید کسی دوست کو دے آئے تھے، میں نے اس آدمی کو کنونس کیا کہ وہ مجھے وہ البم دے دے۔ شائستگی سے، نرمی سے، دلیل سے اور وہ مجھے مل گئی۔ شیرو میں ڈیڈ کبھی یہ عادت نہیں ڈال سکے۔ مجھ میں سے بھی نکال نہیں سکے۔ اب مجھے فتح کو محنت کر کے حاصل کرنا اچھا لگتا ہے ریڈ! یہی وجہ ہے کہ چاہوں تو سعدی یوسف کے سارے خاندان کو ایک بم بلاسٹ میں ختم کر دوں، مگر نہیں، مجھے اپنے بھائی اور اپنے خاندان کے حق میں فیصلہ "حاصل" نہیں کرنا، بلکہ 'جیت' کے آنا ہے۔"

آب دار کے چہرے کے کئی رنگ بدلے، بالی کو مسلتے ہاتھ میں تیزی آ گئی۔ وہ سوچتی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ "میرے اور تمہارے راستے الگ ہیں۔"

"اونہوں..... ابھی نہیں۔" اس نے ایک گلاس آبی کے سامنے رکھا اور دوسرا اپنے سامنے۔ پھر بیٹھا

نہیں۔ ہتھیلیاں کاؤنٹر پہ رکھے وہ اسے نرم سے زخمی پن سے دیکھے گیا۔ "ابھی تمہارے پاس چند دن ہیں۔ اس کے بعد تم جو بھی فیصلہ کرو گی' مجھے قبول ہوگا۔"

"تم نے جو اس روز مجھے ٹیکسٹ بھیجے تھے' ان کا کیا مطلب تھا؟" اس نے جی کڑا کر کے پوچھا۔ ہاشم اسی طرح اس کی آنکھوں میں جھانکے گیا۔

"مطلب تو صاف ظاہر تھا۔ میں نے تمہاری اور فارس کی ایک تصویر دکھا کے پوچھا تھا کہ یہ سچ ہے؟ تم نے جواب نہیں دیا تو میں نے دو تصویریں بھیج کر یہ بتایا تھا کہ وہ اپنی عورتوں کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ وہ دو تصویریں زرتاشہ اور زمر کی تھیں۔"

"زمر کی کیوں؟" وہ پوچھ رہی تھی۔ (پرس میں رکھے اس کے فون کی اس چیٹ میں سے اس نے "کیا یہ سچ ہے" والا پیغام اور زرتاشہ اور زمر کی تصویر مٹا دی تھی' صرف "وہ اپنی عورتوں کی حفاظت نہیں کر سکتا۔" والا پیغام اور اپنی اور فارس کی تصویر رہنے دی تھی۔ اسی طرح اس نے وہ چیٹ فارس کو دکھائی تھی۔)

"تم جلد جان جاؤ گی' میں نے کہا نا' مجھے ایسے کھیل پسند ہیں۔ کیا تم نے فارس کو بتایا؟" گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے اس نے مسکرا کے پوچھا۔

"یہی کہ تم نے زمر کو دھمکی دی ہے؟ ہاں بتایا تھا۔" وہ بے نیازی سے کہہ کر اپنے گلاس سے گھونٹ بھرنے لگی۔ دل زور سے دھڑکا۔

"گڈ۔۔۔" ہاشم مسکرایا۔ زخم زخم مسکراہٹ۔

"وہ مشہور ہو چکے ہیں' تم ان میں سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے ہاشم!" وہ اسی بے نیازی سے بولی تھی۔

"میں ہمیشہ سے unprediclable (غیر متوقع) رہا ہوں۔" اس نے شانے اچکائے اور گلاس اٹھا لیا۔

"مجھے کیوں بلایا ہے؟" اس نے پھر پوچھا۔

"یہ بتانے کے لیے کہ میں تمہیں حاصل نہیں کرنا چاہتا۔ جیتنا چاہتا ہوں۔ اس کی اصلیت دکھانا چاہتا ہوں اور۔۔۔" ہتھیلیاں کاؤنٹر پہ رکھے اس کی طرف جھکا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "اور تمہاری اصلیت سے بھی واقف ہوں۔"

آبدار کی رنگت سفید پڑنے لگی۔ ہاشم پہ جمی نظریں ساکت ہو گئیں۔ "تم نے میرے مقابلے میں فارس کا ساتھ دیا۔ سعدی کو زہریلی سرنج دی' اس کو فرار ہونے میں مدد دی۔ فارس کو اپنے ساتھ لے کر گئیں۔۔۔ تم نے ہر قدم پہ مجھ سے جھوٹ بولا اور میں ہر قدم پہ تم پہ اعتبار کرتا رہا۔"

آبدار کی گردن میں تھوک نگلنے اور گلٹی ابھر کے معدوم ہوتی دکھائی دی۔

"کیوں کیا تم نے یہ آبی؟" وہ دکھ سے پوچھ رہا تھا۔

"اس کو مجھ سے اوپر کیوں رکھ دیا؟"

"نہیں۔۔۔ صرف ایڈونچر چاہ رہی تھی۔" وہ ذرا سا ہکلائی۔

"تو پھر اب میرا ایڈونچر بھی دیکھنا۔"

"مجھے نقصان۔۔۔ نقصان پہنچاؤ گے کیا؟"

"تمہیں؟ کبھی نہیں۔۔۔ مگر اس سے کہنا کہ وہ۔۔۔ اپنے خاندان کی۔۔۔ عورتوں کی۔۔۔ حفاظت نہیں۔۔۔ کر سکتا!" چبا چبا کے ایک ایک لفظ ادا کیا' پھر سیدھا ہوا' کاؤنٹر کے پیچھے سے نکلا' کوٹ اٹھایا اور باہر چلا گیا۔ اس کا گلاس ان چھوا' بھرا ہوا میز پہ رکھا رہ گیا۔

آبدار ابھی تک ٹھنڈے گلاس کو پکڑے ہوئے بیٹھی تھی۔ مشروب کی ٹھنڈک نے اس کی ہڈیوں کو اندر تک جما دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات اس بلڈنگ پہ پر پھیلائے' اس کے سارے بھید ڈھانکے ہوئے تھی اس کے ایک اپارٹمنٹ کے اندر نیم اندھیرا سا تھا۔ اوپن کچن کی بتی جل رہی تھی یا پھر احمر کے کمرے کا نائٹ بلب۔ وہ بیڈ پہ لمبا لیٹا' موبائل دونوں ہاتھوں میں لیے ٹھک ٹھک ٹائپ کیے جا رہا تھا۔ ساتھ میں جمائی روکنے کو منہ پہ ہاتھ بھی رکھتا۔ یہ تو طے تھا کہ نیند تب آتی تھی جب بیٹری ختم ہو جاتی' سو وہ بنا کسی فکر کے لگا ہوا تھا۔

فیس بک پہ مختلف لوگوں کی زندگیوں میں جھانکتا' وہ صفحہ نیچے کرتا جا رہا تھا جب باہر آہٹ سی محسوس ہوئی۔ پہلے وہ چونکا' پھر کسی خیال کے تحت گہری سانس بھری اور تیزی سے بستر سے نیچے اترا۔

"شریف لوگوں میں کوئی تمیز تہذیب ہوتی ہے فارس غازی! چاہے آپ کا بیسٹ فرینڈ ہی ہو۔ اس کے گھر بھی یوں بنا پوچھے داخل نہیں ہو جاتے۔" سلیپر پہنتے ہوئے وہ زور سے چلایا تھا۔ پھر دروازہ کھولا اور باہر نکلا۔

"میرے گھر کے باہر لگی گھنٹی شکل دیکھنے کے لیے نہیں لگی۔ اس پہ انگلی رکھ کے اسے بجایا جاتا ہے غازی! آخر کب سیکھیں گے آپ؟ کیا تیسری دفعہ جیل جانے کے بعد؟" غصے سے بولتا وہ لاؤنج میں آیا اور بتی جلائی۔

لاؤنج سنسان پڑا تھا۔ کچن کی بتی ہنوز جل رہی تھی۔ مرکزی دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ احمر قدرے چوکنا سا ہو کے آگے آیا۔ احتیاط سے دروازہ پورا کھولا۔ باہر لابی خالی تھی۔ سنسان' ویران' اسے نئے سرے سے غصہ آیا۔

"کیا تلاشی لینے آئے ہو غازی؟"

بے زاری سے زور سے دروازہ بند کر کے لاک کیا اور جیسے ہی واپس مڑا' کوئی نوکیلی سی شے اسے گردن میں گھستی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ لڑکھڑا کے پیچھے ہٹا۔ اثر تیز تھا۔ فوری تھا۔ بصارت دھندلا گئی' مگر اتنا نظر آیا کہ سامنے دو ہٹے کٹے آدمی کھڑے تھے اور ان کے ہاتھوں میں بریٹا پستول تھے۔ احمر پوری قوت لگا کے مڑا اور دروازے کی طرف بھاگا۔ دو قدم بعد اسے ٹھوکر لگی۔ اور وہ اوندھے منہ فرش پہ آن گرا..... اٹھنے کی کوشش کی مگر اس کا جسم سن ہوتا جا رہا تھا۔ بصارت دھندلی ہو رہی تھی اور ذہن اندھیروں میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ہم کو ہر دور کی گردش نے سلامی دی ہے
ہم وہ پتھر تھے جو ہر دور میں بھاری نکلے

پارکنگ ایریا عمارت کی بیسمنٹ میں بنا تھا اور دوپہر کے باوجود وہاں اندھیرا پڑا تھا۔ گو کہ مدھم سفید بتیاں روشن تھیں مگر عجب ہولناکی سی چھائی تھی۔ ایسے میں ایک ادھیڑ عمر آدمی سامنے سے چل کر آتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے جوتوں کی دھمک سناٹے کو چیر رہی تھی۔ تیز تیز قدم اٹھاتا وہ قطار میں کھڑی گاڑیوں تک آیا اور جیب سے چابی نکالتے ہوئے ایک سفید کار کے قریب رکا۔

تب ہی اس کے پیچھے آہٹ سی ہوئی۔ قدموں کی چاپ۔ جیسے کوئی کسی ستون کی اوٹ سے نکلا ہو۔ ریموٹ کا بٹن دبا کر کار کو ان لاک کرتے اس نے مڑ کے یوں ہی دیکھا تو ٹھہر گیا۔

ستون کے ساتھ کھڑا نوجوان جیبوں میں ہاتھ ڈالے' فرصت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مدھم اندھیرے اور روشنی کے ملے جلے ماحول کے باعث ادھیڑ عمر آدمی نے آنکھیں سکوڑ کے اسے دیکھا۔ وہ چہرہ شناسا لگتا تھا' مگر کون.....؟

"جب میں ٹین تھا تو میں نے ایک ریسرچ پڑھی تھی۔ اس کے مطابق بچہ اپنی پیدائش سے لے کر پہلے چھ ماہ تک بلیک اینڈ وائٹ دیکھتا ہے' اسے رنگ نظر نہیں آتے۔ بائی دا وے میں سعدی یوسف ہوں' اور آپ ایئر پورٹ سیکورٹی میں موجود وہ آفیسر ہیں جن کو کل صبح عدالت سمن جاری کرے گی' تو میں کہہ رہا تھا کہ....."

قصہ سناتے رک کے سینے پہ ہاتھ رکھے' اس نے اپنا تعارف کرایا اور بات جاری رکھی۔

"چند سائنس دانوں کی ایک تحقیق کے مطابق انسان پہلے چھ ماہ تک بلیک اینڈ وائٹ دیکھتا ہے۔ لیکن اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو ہم ایک عمر تک بلیک اینڈ وائٹ ہی دیکھتے رہتے ہیں۔ بچپن میں اور پھر ٹین ایج میں ہر انسان بلیک یا وائٹ (نیک لوگ' گناہ گار لوگ) لگتا ہے۔ ہمیں ہم اگر کسی ایکٹر' اسکالر' یا سیاست دان سے محبت کرنے لگیں تو اس کو ایسا سفید مجسمہ بنا دیتے

ہیں کہ اس میں خامی نظر نہیں آتی' اور جب خامی دیکھ لیں تو اسے دیکھنا بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن مسعود صاحب' جب ہم میں سے اکثر لوگ میری عمر کو پہنچتے ہیں تو جان پاتے ہیں کہ یہاں نہ کوئی سفید ہے' نہ سیاہ۔ سب سرمئی ہیں۔ کوئی گہرا سرمئی۔ کوئی ہلکا سرمئی۔ کوئی مٹیالا' کوئی کم گدلا۔ مگر بے داغ کوئی نہیں ہے۔"

مسعود اودھیڑبن میں گھرا ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ چابی ہاتھ میں تھی اور نظریں اس پہ ٹکی تھیں۔ سعدی بولتے بولتے قریب آنے لگا۔ قدموں کی چاپ نے پھر سے خاموشی کو چیرا۔

"لوگ کہتے ہیں ہماری چوائسز ہمیں ڈیفائن کرتی ہیں۔ وہ انتخاب جو ہم کرتے ہیں' وہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ہم کون ہیں۔ ہم ہلکے سرمئی ہیں یا گہرے سرمئی' اس کا فیصلہ وہ کام کرتے ہیں جو ہم نے کیے ہوتے ہیں' مگر نہیں ہے۔" وہ اب اس کے بالکل مقابل آکھڑا ہوا تھا اور نفی میں سرہلا کے اس کی آنکھوں میں جھانک کے کہہ رہا تھا۔

"میں نے دو انسانوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا ہے۔ میرے مدمقابل جو شخص ہے' اس نے میرے خاندان کے دو انسانوں کو قتل کروایا ہے۔ یہ وہ انتخاب ہے' جو ہم دونوں نے کیا۔ کیا یہ ہمیں ڈیفائن کرسکتے ہیں؟ ہمیں ڈسکرائب کرسکتے ہیں؟" سنجیدگی سے ٹھہر ٹھہر کے وہ بولتا رہا۔

"نہیں۔۔۔ کیونکہ میرا خیال ہے ہمارے اچھے یا برے ہونے کا تعین ہمارے چنے گئے راستے نہیں کرتے' بلکہ وہ راستے کرتے ہیں جو ہم نے نہیں چنے ہوتے۔ وہ فیصلے' وہ انتخاب کرتے ہیں جو ہم نے میسر ہونے کے باوجود نہیں کیے ہوتے۔ ہاشم کاردار نے دو انسانوں کو قتل کرنے کا "انتخاب" کیا' مگر اس کے پاس دوسرے راستے بھی تھے۔ نیب میں کیس لڑتا اور خود کو بری کروالیتا' یا پھر اگر فیصلہ اس کے خلاف آتا تو پلی بارگین کرلیتا۔ پیسے واپس کرتا اور رہائی مل جاتی۔ یا پھر وارث غازی پہ چند الزامات لگوا کے اس کو جاب سے نکلوا دیتا۔ یا پھر وہ دہشت گردوں کے خلاف وعدہ معاف گواہ بن جاتا اور اس کو فوج خود پروٹیکشن دیتی' یہ وہ راستے تھے جو اس نے نہیں چنے۔ اس نے قتل کا راستہ چنا۔ مگر جب میں نے دو قتل کیے تو میرے پاس دوسرا راستہ یہی تھا کہ خود کو مرنے دوں۔ میں نے اپنی جان بچائی۔ سروائیول کو چنا۔ ان دونوں آدمیوں کو قتل کروانے کو چنا' سوائے ہلاکت کے دوسرے راستے کے۔ آپ مجھے اور ہاشم کو ایک ہی ترازو میں نہیں تول سکتے۔ کیونکہ اس کے پاس آپشنز تھے' میرے پاس نہیں تھے۔ اسی لیے میں یہاں آپ سے یہ کہنے آیا ہوں۔"

آدمی نے شانے اچکائے' جیسے ناسمجھی سے پوچھا ہو کہ "کیا؟" اس کی چابی ابھی تک ہاتھ میں تھی۔

"عین ممکن ہے کہ اگلی پیشی پہ آپ کو پیش ہونا ہو۔ درمیان میں جتنے دن آئیں گے' ان میں ہاشم کاردار آپ کو اپروچ کرکے آپ کو خریدنا چاہے گا۔ وہ آپ کو بہت سے راستے دکھائے گا۔ چناؤ کے لیے بہت سے انتخاب۔ میں آپ سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ آپ جو بھی فیصلہ کریں گے۔ وہ ساری زندگی کے لیے آپ کے کردار کا تعین کرے گا۔ آپ کیسا انسان بننا چاہتے ہیں' آپ کیسے مسلمان رہنا چاہتے ہیں اور آپ کیسے پاکستانی بن کر دکھانا چاہتے ہیں' اس سب کا فیصلہ آپ کا وہ انتخاب کرے گا جو آپ منتخب کریں۔ ساری زندگی مسعود صاحب وہ آپ کو haunt (ہانٹ) کرے گا۔ کبھی پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اس لیے کورٹ میں آئیے گا تو سچ بولیے گا۔ اگر آج جھوٹ بول دیا' تو ساری زندگی آپ خود بھی اپنے کسی سچ پہ اعتبار نہیں کرسکیں گے۔ جھوٹے لوگوں کی ایک بہت بڑی سزا یہ ہوتی ہے کہ ان کو اپنی باتوں اور دعووں پہ خود بھی یقین نہیں آتا' کہہ کے بھول جاتے ہیں اور بھول کے کہہ جاتے ہیں۔"

پھر وہ خاموش ہوا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔ اس آدمی نے سر جھٹکا اور اپنی کار کی طرف مڑ گیا۔ دروازے کو ہینڈل سے باہر کھینچتے اس نے پھر سے مڑ کے دیکھا۔

پارکنگ ایریا سنسان پڑا تھا۔ ستون دھند لے سے نظر آرہے تھے۔ اب وہاں کوئی نہیں تھا۔

ہیں کہ اس میں خامی نظر نہیں آتی، اور جب خامی دیکھ لیں تو اسے دیکھنا بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن مسعود صاحب! جب ہم میں سے اکثر لوگ میری عمر کو پہنچتے ہیں تو جان جاتے ہیں کہ یہاں نہ کوئی سفید ہے، نہ سیاہ۔ سب سرمئی ہیں۔ کوئی گہرا سرمئی۔ کوئی ہلکا سرمئی۔ کوئی مٹیالا، کوئی کم گدلا۔ مگر بے داغ کوئی نہیں ہے۔"

مسعود دمیر بن میں کھڑا ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ چابی ہاتھ میں تھی اور نظریں اس پہ ٹکی تھیں۔ سعدی بولتے بولتے قریب آنے لگا۔ قدموں کی چاپ نے پھر سے خاموشی کو چیرا۔

"لوگ کہتے ہیں ہماری چوائسز ہمیں ڈیفائن کرتی ہیں۔ وہ انتخاب جو ہم کرتے ہیں، وہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ہم کون ہیں۔ ہم ہلکے سرمئی ہیں یا گہرے سرمئی، اس کا فیصلہ وہ کام کرتے ہیں جو ہم نے کیے ہوتے ہیں، مگر نہیں..." وہ اب اس کے بالکل مقابل آکھڑا ہوا تھا اور نفی میں سرہلا کے اس کی آنکھوں میں جھانک کے کہہ رہا تھا۔

"میں نے دو انسانوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا ہے۔ میرے مدمقابل جو شخص ہے، اس نے میرے خاندان کے دو انسانوں کو قتل کروایا ہے۔ یہ وہ انتخاب ہے جو ہم دونوں نے کیا۔ کیا یہ ہمیں ڈیفائن کرسکتے ہیں؟ ہمیں ڈسکرائب کرسکتے ہیں؟" سنجیدگی سے ٹھہر ٹھہر کے وہ بولتا رہا۔

"نہیں... کیونکہ میرا خیال ہے ہمارے اچھے یا برے ہونے کا تعین ہمارے چنے گئے راستے نہیں کرتے، بلکہ وہ راستے کرتے ہیں جو ہم نے نہیں چنے ہوتے۔ وہ فیصلے، وہ انتخاب کرتے ہیں جو ہم نے میسر ہونے کے باوجود نہیں کیے ہوتے۔ ہاشم کاردار نے دو انسانوں کو قتل کرنے کا "انتخاب" کیا، مگر اس کے پاس دوسرے راستے بھی تھے۔ نیب میں کیس لڑتا اور خود کو بری کروالیتا، یا پھر اگر فیصلہ اس کے خلاف آتا تو پلی بارگین کرلیتا۔ پیسے واپس کرتا اور رہائی مل جاتی۔ یا پھر وارث غازی پہ چند الزامات لگوا کے اس کو جاب سے نکلوا دیتا۔ یا پھر دہشت گردوں کے خلاف وعدہ معاف گواہ بن جاتا اور اس کو فوج خود پروٹیکشن دیتی، یہ وہ راستے تھے جو اس نے نہیں چنے۔ اس نے قتل کا راستہ چنا۔ مگر جب میں نے دو قتل کیے تو میرے پاس دوسرا راستہ یہی تھا کہ خود کو مرنے دوں۔ میں نے اپنی جان بچائی۔ سروائیول کو چنا۔ ان دونوں آدمیوں کو قتل کرنے کو چنا، سوائے ہلاکت کے دوسرے راستے کے۔ آپ مجھے اور ہاشم کو ایک ہی ترازو میں نہیں تول سکتے۔ کیونکہ اس کے پاس آپشنز تھے۔ میرے پاس نہیں تھے۔ اسی لیے میں یہاں آپ سے یہ کچھ کہنے آیا ہوں۔"

آدمی نے شانے اچکائے، جیسے نا سمجھی سے پوچھا ہو کہ "کیا؟" اس کی چابی ابھی تک ہاتھ میں تھی۔

"عین ممکن ہے کہ اگلی پیشی پہ آپ کو پیش ہونا ہو۔ درمیان میں جتنے دن آئیں گے، ان میں ہاشم کاردار آپ کو اپروچ کرکے آپ کو خریدنا چاہے گا۔ وہ آپ کو بہت سے راستے دکھائے گا۔ چناؤ کے لیے بہت سے انتخاب۔ میں آپ سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ آپ جو بھی فیصلہ کریں گے۔ وہ ساری زندگی کے لیے آپ کے کردار کا تعین کرے گا۔ آپ کیسا انسان بننا چاہتے ہیں، آپ کیسے مسلمان رہنا چاہتے ہیں اور آپ کیسے پاکستانی بن کر دکھانا چاہتے ہیں، اس سب کا فیصلہ آپ کا وہ انتخاب کرے گا جو آپ منتخب کریں۔ ساری زندگی مسعود صاحب وہ آپ کو haunt (ہانٹ) کرے گا۔ کبھی پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اس لیے کورٹ میں آئیے گا تو سچ بولیے گا۔ اگر آج جھوٹ بول دیا نا، تو ساری زندگی آپ خود بھی اپنے کسی سچ پہ اعتبار نہیں کرسکیں گے۔ جھوٹے لوگوں کی ایک بہت بڑی سزا یہ ہوتی ہے کہ ان کو اپنی باتوں اور دعووں پہ خود بھی یقین نہیں آتا، کہہ کے بھول جاتے ہیں اور بھول کے کہہ جاتے ہیں۔"

پھر وہ خاموش ہوا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔ اس آدمی نے سر جھٹکا اور اپنی کار کی طرف مڑ گیا۔ دروازے کو ہینڈل سے باہر کھینچتے اس نے پھر سے مڑ کے دیکھا۔

پارکنگ ایریا سنسان پڑا تھا۔ ستون دھندلے سے نظر آرہے تھے۔ اب وہاں کوئی نہیں تھا۔

"کبھی منظر بدلنے پر بھی قصہ چل نہیں پاتا
کہانی ختم ہوتی ہے کبھی انجام سے پہلے"

کچہری کی راہداری میں وہی دانتے کی جہنم جیسا رش، شور اور افراتفری کا عالم تھا۔ ایسے میں کمرہ عدالت کے دروازے کے باہر کھڑا سعدی شہزاد کو سمجھانے کے لیے قدرے اونچی آواز میں بول رہا تھا۔

"مجھے بہت خوشی ہے کہ تم نے اپنی امی کو سپورٹ کیا ہے اور وہ گواہی دے رہی ہیں۔" انداز میں تشکر تھا۔ بیساکھی تھامے کھڑا لڑکا سر کو بار بار ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔ "صحیح۔ صحیح۔"

"اب اندر چلتے ہیں۔" سعدی نے اس کو اشارہ کیا اور پھر یکے بعد دیگرے وہ دونوں آہستہ سے کمرے میں داخل ہوئے۔

وہاں کسی کلاس روم کی طرح کی خاموشی چھائی تھی۔ جج صاحب خاموشی سے کٹہرے میں کھڑی خاتون کو دیکھ رہے تھے، جس نے سر پہ دوپٹا اوڑھ رکھا تھا اور وہ سامنے کھڑی زمر کے سوالوں کا جواب دے رہی تھی۔ اس کے نقوش اپاہج لڑکے کی مانند بنگالی تھے' اور رنگت گہری سانولی۔ سعدی اس کو لیے پچھلی کرسی پہ آبیٹھا۔ آج فارس نہیں آیا تھا' البتہ...... سعدی نے گردن موڑ کے دیکھا۔ قریب میں چشمے والا آدمی خاموشی سے بیٹھا ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر عجیب سی الجھن ہوتی تھی۔

"مسز عصمت۔ آپ کو پورا یقین ہے کہ آپ نے آپریٹر مسعود عالم کو یہ کہتے سنا تھا؟" زمر پوچھ رہی تھی۔

"جی' مجھے پورا یقین ہے کہ میں نے یہی الفاظ سنے تھے جو میں پہلے بھی بتا چکی ہوں۔ جب آپ لوگ سی سی ٹی وی فوٹیج دیکھنے آئے تھے تو آپ کے جانے کے بعد وہ اپنے ایک کولیگ سے کہہ رہے تھے کہ فکر کی کوئی بات نہیں' انہوں نے کاردارز کے لڑکے کی فوٹیج ہینڈل کرلی ہی ہے۔"

"اور ہینڈل کرنے سے ان کی مراد ڈیلیٹ کرنا تھا؟"

"آبجیکشن۔ گواہ سے رائے مانگی جارہی ہے۔" وہ پیچھے سے اکتا کے بولا تھا۔ زمر امپریشن بنا چکی تھی سو "میں سوال واپس لیتی ہوں۔" کہہ کر واپس مڑ گئی۔

ہاشم فوراً" اپنے تاثرات بدل کے' مسکراتا ہوا اٹھا۔ کوٹ کا بٹن بند کیا اور کٹہرے کے سامنے آیا۔

"مسز عصمت!" اس نے مسکرا کے اس کو مخاطب کیا۔ "کیا آپ نے مسعود عالم صاحب کو مجھ سے یا میرے خاندان کے کسی فرد سے بات کرتے سنا؟"

"نہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"کیا آپ نے ان کو نوشیرواں کاردار کا نام لیتے سنا؟"

"نہیں مگر انہوں نے کاردارز کا لڑکا کہا تھا اور......"

ہاشم نے جیب سے ہزار روپے کا نوٹ نکالا اور اس کے سامنے کیا۔

"اس پہ گورنر اسٹیٹ بینک شاہد کاردار کے دستخط موجود ہیں۔ کیا آپ کو کبھی یہ خیال آیا کہ ہم اس ملک کے واحد کاردار نہیں ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے لیکن انہوں نے یہ بات اس کے (زمر کی طرف اشارہ کیا) جانے کے بعد کی تھی۔"

"اور اس بات کو کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟" نوٹ واپس جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔

"تین ماہ شاید۔"

"اور ان تین ماہ میں آپ نے کبھی مسعود صاحب کی شکایت اوپر کی؟"

"میں نے کی تھی' لیکن کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔"

"آف کورس آپ نے کی تھی۔" وہ مڑا اور اپنی میز سے چند کاغذ اٹھائے اور جب واپس عصمت بی بی کی طرف گھوما تو لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔ "اور اس سے پہلے آپ ڈپارٹمنٹ میں تین مختلف لوگوں کی شکایت کرچکی ہیں۔ اور ان میں سے ایک کے خلاف کارروائی کی گئی تھی' نام یاد ہے آپ کو ان کا؟"

"آبجیکشن یور آنر! مسز عصمت کے ریکارڈ کا گواہی سے کیا تعلق ہے؟"

ور رولڈ۔ جواب دیجیے۔" جج صاحب نے گویا ناک سے مکھی اڑائی۔

"طارق محمود۔" عصمت کی آواز پست تھی۔

"جی بالکل۔ طارق محمود صاحب جن کے خلاف آپ نے ہراسمنٹ ایٹ ورک پلیس کی شکایت کی تھی اور ان کو معطل کروایا گیا تھا' اور۔۔۔ اور واقعے اور ان کی سیٹ کا چارج آپ سنبھالتی ہیں نا' آج کل۔"

"آبجیکشن یور آنر۔" زمر بے زاری سے کھڑی ہوئی۔ "کاردار صاحب گواہ کی کردار کشی کر رہے ہیں۔"

"اوور رولڈ مسز زمر۔ عدالت کو ان کا جواب سننے دیجیے' جی بولیے۔" جج صاحب نے خشک لہجے میں خاتون گواہ کو اشارہ کیا۔

"جی۔ ان کا چارج میں سنبھالتی ہوں' مگر انہوں نے واقعی ہراسمنٹ کی تھی اور دوسری کولیگز گواہ ہیں۔"

مگر ہاشم اس کے ساتھ ہی جج صاحب کی طرف رخ کر کے کہنے لگا۔ "یور آنر' یہ صرف ایک heresay (سنی سنائی بات) ہے' ایک ایسی خاتون جن کا کام ہی دوسرے کولیگز کی ٹانگ کھینچنا ہے' ان کے بیان پہ عدالت ائیرپورٹ سیکورٹی کے کنٹرول روم آپریٹر کو سمن نہیں کر سکتی۔ خاتون ان کی جگہ لینے کے لیے جھوٹ بول رہی ہیں۔"

"یور آنر' اگر یہ Heresay ہے تو اس کو ثابت کرنے کے لیے ہمیں اس آفیسر کو کورٹ میں پیش کرنا پڑے گا۔ ورنہ کاردار صاحب کا یہ الزام ہم کیسے رد کر سکیں گے؟"

"بس بس!" ان دونوں کے ایک ساتھ بول اٹھنے کے باعث جج صاحب نے ہاتھ اٹھا کے ان کو خاموش رہنے کا کہا پھر ہاشم کو دیکھا۔

"بات تو ان کی سننی پڑے گی' اگر انہوں نے فوٹیج کے ساتھ ٹیمپرنگ نہیں کی تو ان کو کورٹ میں آکر اپنی صفائی دینی پڑے گی۔ اس لیے اگلی پیشی پہ۔۔۔" وہ اب حکم جاری کر رہے تھے۔ کٹہرے میں کھڑی عورت مغموم نظر آتی تھی' اور اس کا اپاہج بیٹا حیران پریشان سا سعدی کو دیکھ رہا تھا۔

"ممی۔۔۔ میری امی جھوٹ نہیں بولتیں کبھی۔ وہ کسی کی جاب لینے کے لیے تو ایسا نہیں کر رہیں۔"

"سب کو پتا ہے۔" سعدی نے اداسی سے اس کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھ کے تسلی دی۔

"مگر یہ زیادتی ہے۔"

"یہ انصاف کی عدالتیں نہیں ہیں میرے دوست۔ یہ قانون کی عدالتیں ہیں۔" سر جھٹک کے وہ قریب بیٹھے چشمے والے آدمی کو دیکھنے لگا' جو اسے ہی دیکھ رہا تھا' مگر فوراً" اپنا رخ پھیر گیا اور سر جھکا کے اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھنے لگا۔

سعدی نے گھڑی دیکھی اور سوچا کہ اگر فارس یہاں ہوتا تو کیا کہتا' مگر وہ تھا کہاں؟

☼ ☼ ☼

میں اپنی جفاؤں پہ نادم نہیں ہوتا
میں اپنی وفاؤں کی تجارت نہیں کرتا

ہارون عبید کی رہائش گاہ کا آہنی اونچا گیٹ اس کی کار کے نزدیک آتے ہی میکانکی انداز میں سلائیڈ ہو کے کھلنے لگا۔ اسٹیرنگ پہ ہاتھ رکھے فارس چند لمحے انتظار کرتا رہا۔ اس کے چہرے پہ معمولی سی فکر مندی تھی اور ماتھے پہ بل۔ آنکھیں پرسوچ انداز میں سکڑی ہوئی تھیں۔ گیٹ پورا کھل گیا تو اس نے کار آگے بڑھادی۔

چند منٹ بعد وہ لان عبور کر کے آبدار کے کلینک کی طرف جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ جینز پہ سرمئی وی گلے کی شرٹ پہنے' آستینیں ذرا موڑ رکھی تھیں۔

کلینک کے اندر وہ بے چینی سے ٹہل رہی تھی جب دروازہ کھلا۔ آبی فوراً" گھومی۔ آنکھوں میں چمک در آئی۔ "شکر آپ آگئے۔"

"کیا ہوا ہے؟ آپ نے اتنی ایمرجنسی میں بلایا۔ میں کورٹ جا رہا تھا۔" وہ حیرت بھری فکر مندی سے

کہتا آگے آیا اور اس کی میز کے سامنے والی کرسی کھینچی۔ ساتھ ہی اس کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بدقت مقابل کاؤچ پہ آ گئی۔ دونوں کے درمیان چند فٹ کا خلا تھا۔

"اب بتائیے' کیوں پریشان ہیں؟" وہ نرمی اور ہمدردی سے پوچھ رہا تھا۔ آبدار کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"میں بہت خوف زدہ ہوں۔"

"مسز کاردار نے کچھ کہا ہے؟"

آبی نے نفی میں گردن ہلائی۔

"پھر؟"

"ہاشم ملا تھا۔ اس سے میں نے پوچھا کہ میری اور آپ کی تصویر بھیج کر اس نے ساتھ یہ کیوں لکھا کہ وہ اپنی عورتوں کی حفاظت نہیں کر سکتا؟"

فارس ذرا چوکنا ہو کے بیٹھا۔ "پھر؟"

"پھر اس نے کہا کہ...... کہ فارس تمہاری حفاظت نہیں کر سکتا اور یہ کہ...... وہ مجھے آپ کی عورتوں میں شمار کرتا ہے۔" وہ روانی سے جھوٹ بول رہی تھی۔

"اور کیا کہا اس نے؟ حنین' یا زمر کا ذکر کیا؟" وہ بے چین ہو گیا تھا۔

"نہیں' ان کا نہیں۔" وہ تیزی سے بولی۔ "آپ کے خاندان والے اتنے مشہور ہو چکے ہیں' ان کو وہ نقصان پہنچائے گا تو پہلا شک اسی پہ جائے گا' اسی لیے وہ ایسا نہیں کرے گا۔ مگر میں...... "اس کا گلا رندھا۔

فارس نے گہری سانس لی اور پیچھے کو ہوا۔ "وہ کچھ نہیں کرے گا۔"

"ارے واہ۔" آبی کی بھیگی آنکھوں میں شکوہ در آیا۔ "آپ نے اپنی عورتوں کی خیریت جان لی تو کیسے ریلیکس ہو گئے۔ اور میرا کیا' جسے آپ نے اس سب میں دھکیل دیا۔ یاد رکھیے' اس سب میں' میں آپ کی وجہ سے آئی ہوں۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" اس کے چہرے پہ معذرت خواہانہ سا تاثر ابھرا۔ "میں اتنے دن سے آپ کی حفاظت کر رہا ہوں نا' آگے بھی کرتا رہوں گا۔ آپ کے گارڈز کے ساتھ ان ٹچ ہوں' دن میں کئی دفعہ ان سے آپ کی خیریت پوچھتا ہوں' ہر دو گھنٹے بعد آپ کو فون کرتا ہوں' آپ کی کالونی کے سی سی ٹی وی کی لائیو فیڈ چیک کرتا رہتا ہوں۔ آپ سے کئی کلو میٹر کے فاصلے پہ رہتا ہوں' اتنی دور سے جتنا کر سکتا ہوں وہ کر رہا ہوں نا۔"

"اگر آپ دور نہ ہوتے تو یہ زیادہ آسان ہوتا۔ ہے نا؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے بولی تھی۔ وہ ہلکا سا چونکا۔

"سوری؟"

"ضروری تو نہیں ہے کہ آپ دور رہیں۔ آپ قریب بھی تو ہو سکتے ہیں۔"

فارس چند لمحے اسے دیکھتا رہا' پھر موبائل پہ وقت دیکھا۔ "مجھے چلنا چاہیے۔" لہجہ خشک تھا مگر وہ اسی بے خودی کے عالم میں اسے تکتے ہوئے بولی تھی۔

"اگر آپ مجھ سے شادی کر لیں تو وہ مجھے نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔"

کمرے میں ایک دم عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ فارس غازی کی پیشانی کی رگیں ابھر آئیں' آنکھوں میں برہمی در آئی' اور ایک گہری سانس لے کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے چلنا چاہیے۔"

وہ تیزی سے اٹھی۔ "اصلی والی شادی نہیں' صرف پیپر میرج۔ صرف اس ٹرائل تک۔ تاکہ وہ مجھے نقصان نہ پہنچائے۔ جب اسے پتا چلے گا کہ میں آپ کی بیوی ہوں تو وہ مجھے کبھی کچھ نہیں کہہ سکے گا۔ وہ آپ سے ڈرتا ہے۔ آپ...... آپ مجھ سے شادی کر لیں۔ سچ میں۔ ورنہ وہ اور اس کی ماں مجھے مار دیں گے۔"

فارس نے آنکھیں میچیں' انگلی اور انگوٹھے سے بند آنکھوں کو مسلا اور پھر نفی میں سر ہلایا۔ پھر آنکھیں کھول کے اسے دیکھا۔ "چار سال کی جیل' ایک سال سے مدمقابل مسائل...... اور مجھے لگتا تھا آبدار صاحبہ کہ میں بہت گھاگ ہو چکا ہوں' اب کسی کی باتوں میں نہیں آ سکتا۔ مگر آپ نے ثابت کر دیا کہ میں بھی ایک

انسان ہی ہوں۔" نفی میں افسوس سے سر ہلاتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

"مجھے جس عورت سے محبت ہے اور جو میری بیوی ہے' وہ ٹھیک کہتی تھی۔ آپ نہیں بدلیں' آپ نے صرف اپنی تکنیک بدلی ہے۔"

"کیا میری حفاظت کے لیے آپ مجھ سے ایک پیپر کانٹریکٹ بھی نہیں کر سکتے؟ میں یہ صرف اپنی حفاظت کے لیے کہہ رہی ہوں۔" آنسو آبی کی آنکھوں سے ٹوٹ کر گرنے لگے۔

"نہیں' میں نہیں کر سکتا' اور میرا نہیں خیال کہ آپ کو کسی حفاظت کی ضرورت ہے۔ آپ نے ٹھیک کہا تھا کہ آپ کو بلانے کے طریقے آتے ہیں مگر اب میں نہیں آؤں گا۔ بہت ہو گیا۔" برہمی سے کہتا وہ دروازہ کھول کے باہر نکل گیا۔ وہ تیزی سے اس کے پیچھے آئی۔

"اور مجھے جس دلدل میں آپ نے دھکیل دیا' اس کا کیا؟"

"آپ نے سب کچھ اپنی مرضی سے کیا تھا۔" وہ خشک لہجے میں کہہ کر آگے بڑھ رہا تھا۔ آنکھوں میں بے زاری اور برہمی تھی۔ وہ تیز تیز اس کے پیچھے آ رہی تھی۔ شاید رو بھی رہی تھی۔

"میرے احسان ہیں آپ کے اوپر۔"

"اور میں کب سے ان کی قیمت چکا رہا ہوں۔ زمر سے میرا ریلیشن بار بار بدظنی کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے کیونکہ میں ان احسانوں کی قیمت اتار رہا ہوں مگر اب بہت ہو چکا۔" گردن موڑ کے غصے سے اس کو دیکھا۔

"اب میں مزید آپ کے اس گیم کا حصہ نہیں بن سکتا۔"

"میں نے ایسا کیا کہا ہے جو آپ غصہ ہو رہے ہیں؟ صرف اتنا ہی تو کہا ہے کہ مجھے سہارا دیں' مجھ سے شادی کرلیں' صرف میں حفاظت......"

وہ جو اپنی کار کا دروازہ کھول رہا تھا' ایک دم دھاڑ سے دروازہ بند کیا اور غصے سے اس کی طرف گھوما۔

"کیا آپ میں تھوڑی بھی عزتِ نفس ہے؟ ذرا سی بھی گریس؟ معمولی سی سیلف اسٹیم؟ کیا اپنی خواہشات کے پیچھے خود کو اتنا گرانا ٹھیک ہوتا ہے؟ نو ناٹ' مجھے فخر ہے اس بات پہ کہ جو عورت میری زندگی میں ہے' وہ عزت اور وقار کا پیکر ہے۔ کبھی کسی کے سامنے حتیٰ کہ میرے سامنے بھی خود کو نہیں گرائے گی۔ اور آج مجھے اس پہ زیادہ فخر ہو رہا ہے۔" اس نے غصے سے کہہ کر دروازہ کھولا۔

"اور اگر وہ نہ رہے؟" وہ جو اندر بیٹھ رہا تھا' اس کے الفاظ پہ لمحے بھر کو ٹھہرا پھر سر جھٹک کے اگنیشن میں چابی گھسانے لگا۔ دروازہ بند نہیں کر سکتا تھا' اس پہ آبی کے ہاتھ تھے۔ وہ آنکھوں میں دکھ' غصہ' نفرت لیے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اگر وہ مر جائے' کیا تب آپ دیکھ پائیں گے کسی دوسرے کی طرف؟ کیا تب احساس کر سکیں گے کہ کون آپ کے لیے خود کو کتنا گرا چکا ہے؟"

فارس نے نظر انداز کرتے ہوئے کار اسٹارٹ کی' اور دروازہ زور سے کھینچ کے بند کیا۔ "اب مجھے کال مت کیجیے گا۔" درشتی سے تنبیہہ کر کے کار ریورس کرنے لگا۔

"آپ نے میرا دل توڑا ہے فارس غازی! میں آپ کے لیے اتنا گری' اتنا جھکی اور آپ اتنے سنگ دل ہیں۔ ٹوٹے دل کی بددعا سے آپ کو ڈر نہیں لگتا تو پھر ٹھیک ہے۔" اس نے ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں رگڑیں۔ اور دکھ سے اسے کار پیچھے کرتے دیکھا۔

"اللہ کرے وہ مر جائے۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے مر جائے۔ اللہ کرے آپ اسے مرتے ہوئے' ٹوٹتے بکھرتے ہوئے دیکھیں۔ اپنی آنکھوں کے سامنے۔ پھر آپ کو میرے دل کے کرب کا اندازہ ہوگا۔"

اسے دور جاتے دیکھ کے وہ چلا چلا کے کہہ رہی تھی۔ اور وہ جتنی تیزی سے ہو سکتا تھا' وہ کار وہاں سے نکال رہا تھا۔ اس کی چیخوں کی آوازیں دور تک سنائی دے رہی تھیں۔ جس لمحے کار باہر سڑک پہ آئی' اس نے ایکسیلیٹر کو پوری قوت سے دبایا اور کار کو سڑک پہ

بھگاتا آگے لے گیا۔

عرصے بعد اسے لگا تھا کہ وہ آبدار کے احسانوں کی زنجیر سے آزاد ہو گیا تھا۔ ہلکا اور آزاد۔

☼☼☼

خزانہ زروگوہر پہ خاک ڈال کے رکھ
ہم اہل مہر و محبت ہیں دل نکال کے رکھ

مور چال میں اس رات دس بجے کے ڈرامے کا وقت ختم اور اسامہ کی کلاس کا وقت شروع ہو چکا تھا۔ لاؤنج ویران تھا۔ بتیاں بجھی ہوئی تھیں، مگر ندرت کا کمرہ روشن تھا۔ اندر وہ بیڈ پہ بیٹھیں، خفگی سے اسامہ کو لتاڑ رہی تھیں، جو برہمی سے بمشکل ضبط کیے سن رہا تھا۔ حنین تماشائی کی طرح باری باری دونوں کے چہرے دیکھتی تھی۔

"اس عمر میں سعدی کبھی مغرب کے بعد گھر سے باہر نہیں رہا، عشاء پہ نماز پڑھنے جاتا اور سیدھا گھر آتا۔ پھر بھی میں ڈانتی، مجال ہے، جو اس نے برا منایا ہو۔ ہمیشہ سر جھکایا، اور اس شہزادے کو کچھ کہہ دو تو موڈ آف ہو جاتا ہے۔"

"امی آپ مجھ پہ ہر وقت شک کیوں کرتی رہتی ہیں؟" وہ بگڑ کے بولا۔ "شاہ زیب کا گھر ساتھ والی اسٹریٹ میں ہے، میں اس سے نوٹس لینے ہی گیا تھا نماز کے بعد۔"

"مجھ سے پوچھتے ہوئے منہ ٹوٹ جاتا تھا؟ ہاں؟ مجھ سے کیوں نہیں پوچھا؟"

"نہیں نہیں، آپ کو لگتا ہے میں نشہ کرنے لگ گیا ہوں یا شاید سڑک پہ کھڑے ہو کر لڑکیاں تاڑتا ہوں، یا لوگوں سے موبائل چھینتا ہوں۔"

"دیکھو دیکھو اس کی زبان۔ ماں کے آگے بڑا بولنا آگیا ہے۔ سب جانتی ہوں میں، یہ جو اس کے دوست ہیں نا، یہی سکھاتے ہیں اس کو۔"

"ہر وقت میرے دوستوں کے پیچھے پڑی رہا کریں آپ بس۔" وہ سرخ چہرہ اور آنکھوں میں آنسو لیے تیزی سے باہر نکلا اور دروازہ ٹھاہ مارا۔

"امی! آپ اس کے دوستوں پہ مت آیا کریں۔" حنین نے سمجھانے کی کوشش کی۔

ندرت نے اتنی ہی اکتاہٹ سے اسے دیکھا۔

"زیادہ بک بک نہ کرو۔ مجھے پتا ہے تم بے غیرتوں کو کیسے پالنا ہے۔ اب جاؤ، سر نہ کھاؤ میرا۔ باپ ہوتا نا تو تم دیکھتی کیسی زبانیں چلتی ہیں تم لوگوں کی۔ ماں کو دیکھ کر شیر ہو جاتے ہو۔"

"چلیں جی، ہو گیا ایموشنل ڈراما شروع۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

اوپر آئی تو سیم کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اور وہ منہ پہ تکیہ رکھ کے لیٹا ہوا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر اندر آئی اور اس کے سر پہ آن کھڑی ہوئی۔

"امی تم پہ شک نہیں کرتیں۔"

"جاؤ موٹی، مجھے تم سے بات نہیں کرنی۔" وہ رندھی آواز میں تکیے کے نیچے سے بولا تھا۔

"امی صرف تمہاری حفاظت چاہتی ہیں۔ سب مائیں چاہتی ہیں۔ اگر ماں باپ بچوں کے آنے جانے کے اوقات پر سختی کرتے ہیں، پوچھ گچھ کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ ان پر شک کرتے ہیں، یا ان کو ان کے دوستوں سے کوئی خطرہ ہے۔ وہ صرف ایکسیڈنٹ، دہشت گردی، چوری چکاری کی وارداتوں سے ڈرتے ہیں، جسمانی نقصان سے ڈرتے ہیں۔ اگر شک کرتے ہوتے تو پوچھ گچھ نہ کرتے، خاموش ہو جاتے یا دوسری انتہا یعنی مار پیٹ پہ جاتے۔ یہ پوچھ گچھ نہ ہوں تو ہماری مائیں، مائیں نہ لگیں، نوکرانیاں لگیں۔ کھانا، کپڑے، آرام، وہ سب تو نوکرانی بھی دیتی ہے۔ تم ٹین ایجرز کو خود فیصلہ کرنا ہے کہ تم ماں کو نوکرانی کی جگہ دینا چاہتے ہو یا ماں کی!"

سیم نے تکیہ ہٹا کے گلابی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ "ہاں تمہیں جیسے بڑا پتا ہے، تمہارے کون سے دس بچے ہیں جو تمہیں پتا ہو۔ اور......" وہ رکا اور پھر تنک کے بولا۔ "تمہارا تو کوئی ہیرو بھی نہیں ہے۔"

"اسامہ یوسف!" وہ کمر پہ دونوں ہاتھ رکھ کے شعلہ بار نظروں سے اسے دیکھ کے بولی۔ "میں خود کسی

"ہیرو سے کم ہوں کیا؟"
اسامہ نے کچھ بڑبڑا کے تکیہ منہ پر رکھ لیا اور کروٹ بدل لی۔ حنہ آگے بڑھی' الماری دھیرے سے کھولی' اندر سے کچھ نکال کے کمر کے پیچھے چھپایا اور اونچا سا بولی۔ "مجھے ویسے بھی بہت کچھ چاہیے۔ زندگی بہت کچھ سکھا دیتی ہے۔" پیچھے ہٹتی گئی اور دروازے تک پہنچ کے رکی۔ "اور چاکلیٹ بھی۔" دروازہ کھولا' اور چاکلیٹ کا پیکٹ پکڑے۔ جھپاک سے باہر غائب ہو گئی۔ جیسے ہی دروازہ بند ہوا' سیم کا جوگر ٹھاہ سے آکر اس پہ آکے لگا تھا۔

حنہ اب ہنستی ہوئی اپنے کمرے میں جارہی تھی۔ جہاں کھلی لیپ ٹاپ اسکرین ڈھیروں اسٹینسلز کے آئیڈیاز لیے اس کا انتظار کررہی تھی۔ ہوم ڈیکور' نشہ آور چیز تھی' مگر اچھی چیز تھی۔

نچلی منزل پہ آؤ تو زمر کے کمرے کی بتی جلی تھی۔ وہ ٹیبل پہ تہہ شدہ جاء نماز رکھ کر اب دوپٹا کھول رہی تھی۔ پھر ایک نظر صوفے پہ لمبے لیٹے فارس کو دیکھا جو مسکرا کے اسے دیکھ رہا تھا۔

"دن کیسا گزرا؟" زمر نے پوچھا تو اس کے چہرے پہ مزید طمانیت بکھر گئی۔ آزادی اور اطمینان۔

"بس آج تمہاری یاد آتی رہی۔ تمہاری قدر ہوتی رہی۔ تم سے محبت بڑھتی رہی۔"

"پیسے چاہئیں؟" زمر نے مڑ کے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ مگر اس کا موڈ نہیں بدلا۔

"بہت اچھی لگ رہی ہو آج۔"

"شکریہ۔" وہ اب آئینے کے سامنے کھڑی بال جوڑے میں لپیٹ رہی تھی۔

"تم کتنے دن سے ڈنر کا کہہ رہی تھیں نا' اگر آج چاہو تو۔۔۔ بلکہ نہیں۔۔۔" فارس نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم بتاؤ' تمہیں کیا چاہیے۔"

"ہیں؟" زمر نے پونی میں بال مقید کر کے حیرت سے آئینے کو دیکھا جس میں اس کا عکس نظر آرہا تھا۔ "طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟"

وہ صوفے سے اٹھا اور اس کے قریب آکھڑا ہوا۔ پھر بہت اپنائیت سے اسے دیکھ کے بولا۔ "کوئی خواہش کرو' کچھ مانگو' کوئی ڈیمانڈ سامنے رکھو۔ جو کہو گی پورا کروں گا۔ ڈائمنڈز' ڈنر' گفٹ' کیا چاہیے تمہیں؟ عادتاً" ڈریسر کے کنارے بیٹھا اور محبت سے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ زمر نے پہلے اسے دیکھا' پھر اپنے ہاتھوں کو' پھر دوبارہ اس کے چہرے کو دیکھا۔

"ایسے پوچھ رہے ہو جیسے مرنے والے سے آخری خواہش پوچھی جاتی ہے۔"

"اونہوں' وقت ضائع نہ کرو۔ کچھ مانگو۔"

"اچھا! جو کہوں گی' کرو گے کیا؟" وہ مسکرا کے بولی۔

فارس نے اس کی آنکھوں پہ نظریں جمائے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہوں!"

"تو پھر۔۔۔" وہ مسکرا کے گویا ہوئی۔ "میں یہ چاہتی ہوں کہ۔۔۔ میرا شوہر۔۔۔ میرے لیے میرے ساتھ مل کر۔۔۔ برتن دھوئے۔"

وہ چند لمحے تو سمجھ نہ پایا۔ "سوری؟"

"صداقت اور حسینہ گاؤں گئے ہیں چھٹی پہ۔" اس نے ہاتھ چھڑائے اور آستینیں اوپر چڑھانے لگی۔ "اور حنین کو کوئی نیا ہوم ڈیکور آئیڈیا مل گیا ہے اور اس کو کچن کی فکر نہیں ہے' سو میں سوچ رہی تھی کچن صاف کرلوں تاکہ بھابھی کو نہ کرنا پڑے' مگر بھابھی کا بھائی چونکہ تعاون کرنے والا اور ہمدرد ہے' تو میرا آدھا بوجھ تو کم ہوا۔"

اور بھابھی کے ہمدرد بھائی نے بھنویں اکٹھی کر کے خفگی سے اسے گھورا۔ "تمہارے خیال میں' میں اتنا زن مرید اور بے وقار' بے غیرت مرد ہوں' جو تمہارے کہنے پہ تمہارے ساتھ۔۔۔ اوہ خدایا۔۔۔ کچن میں برتن دھلواؤں گا؟"

"ہاں!" اس نے سادگی سے اسے دیکھتے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

قریباً" پانچ سات منٹ بعد وہ کچن سنک کے آگے کھڑا تھا' آستینیں چڑھائے' نل کھلا تھا' اور وہ جھاگ بھرے اسفنج کو ایک پلیٹ پہ رگڑ رہا تھا۔

"ویسے اتنا برا کام نہیں ہے یہ۔" نارمل سے انداز

میں ساتھ کھڑی سلیب صاف کرتی زمر سے بولا تو اس نے پلٹ کے اسے دیکھا۔

"جیسے کہ تم نے تو کبھی ہاسٹلز اور بیچلر فلیٹس میں برتن دھوئے ہی نہیں ہوں گے۔"

"کبھی نہیں۔ مجھے ہمیشہ خوب صورت نوکرانیاں مل جاتی تھیں۔" فارس نے سر جھکائے پلیٹ پہ پانی گراتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

ٹھک سے زمر نے پلیٹوں کا انبار اس کے سامنے دھرا۔ فارس نے نظر اٹھا کے اسے دیکھا تو وہ آنکھوں میں خفگی لیے اسے گھور رہی تھی۔ وہ گہری سانس بھر کے رہ گیا۔

"کبھی کبھی میں سوچتا ہوں، تمہارے مزاج میں اتنی سختی نہ ہوتی، تم واقعی کنٹرولڈ، ٹھنڈے اور شائستہ مزاج کی ہوتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔"

"میں کہاں سخت ہوں؟" حسب توقع وہ برا مان گئی۔ اب وہ بھی اس کے ساتھ کھڑی اپنا اسفنج بھگو رہی تھی۔

"ہر وقت غصہ کرتی رہتی ہو۔ ہر وقت کام کرتی رہتی ہو۔ بے چارے شوہر کا تو خیال ہی نہیں تمہیں۔ اب اس وقت بھی تم مجھ سے ہیرے جواہرات مانگ سکتی تھیں، پھول یا ڈنر وغیرہ بھی، مگر نہیں، کام ختم کرنے کی پڑی ہوئی ہے تمہیں۔"

"ہیرے جواہرات کے لیے ساری عمر پڑی ہے، کیونکہ تھینکس ٹو ہاشم، میں مرنے نہیں لگی، اس لیے ابھی خاموشی سے برتن دھوؤ۔"

فارس نے مسکراہٹ دبا کے اسے دیکھا۔ وہ چہرہ جھکائے، آستینیں چڑھائے، مگن سی ایک ڈونگے کو صاف کرنے میں لگی تھی۔ بال جوڑے میں مقید تھے اور دو گھنگھریالی لٹیں چہرے کو چھو رہی تھیں۔ اس کے مسلسل دیکھنے پہ زمر نے پلکیں اٹھا کر بھوری آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟"

"یہی کہ میں کتنا خوش قسمت ہوں، جو تم میری زندگی میں ہو۔"

"نشہ تو نہیں کرنے لگ گئے؟" اسے اب واقعی فکر ہونے لگی تھی۔ وہ ہلکا سا ہنس دیا۔

"یوں ہی بس۔ پتا ہے جب میں جیل سے آیا تھا تو ساری دنیا سے بے زار تھا۔ بس یہی مقصد تھا زندگی میں کہ ان سب گناہ گاروں کو تڑپا تڑپا کے ماروں، اپنا انتقام لوں، اور پھر، پھر جو بھی ہو۔ جیل جاؤں، مر جاؤں، کوئی فکر نہیں۔" اس کی آواز میں کرب در آیا۔ "مگر پھر۔۔۔ تم نے مجھ سے شادی کرنے کی ہامی بھری۔ تم مجھے اذیت دینا چاہتی تھیں، اور میں تمہیں۔ تب لگتا تھا ہمارے درمیان کبھی کچھ ٹھیک نہیں ہوگا، مگر تم نے میرے مردہ دل کو زندہ کر دیا۔ اب میں خوش ہوں اور خوش رہنا چاہتا ہوں مگر۔۔۔" اس نے کھلے نل تلے ڈش کی تو پانی کی دھار نے سارے جھاگ کو بہا دیا۔ "مگر اب مجھے مکافاتِ عمل سے ڈر بھی لگتا ہے۔ میرا کارما۔ میرے اعمال کے نتائج۔"

"فارس!" اس نے تحیر سے اسے پکارا۔ "ایسے مت کہو۔"

"نہ کہنے سے حقیقت بدل تو نہیں جائے گی۔" وہ اداسی سے مسکرایا تھا۔ "میں نے بھی غلط کام کیے ہیں۔ غلط لوگوں سے انتقام لینے کے لیے۔ ان لوگوں کی زندگیاں تباہ کی ہیں۔ کسی کی زندگی کی ساری جمع پونجی جلائی، تو کسی کو ایکسپوز کر دیا، کسی کو غائب کرا دیا، ان کی بھی تو اولادیں تھیں اور میں اب بھی وہی کر رہا ہوں، میری مجبوری ہے۔ میں اپنے ہر کام کو جسٹی فائی کر سکتا ہوں مگر اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ مجھے بھی اپنے اعمال کے نتائج بھگتنے پڑیں گے۔"

"اتنا مت سوچا کرو۔ تم قصور وار نہیں ہو۔ تم برابر کا، بلکہ ان کے اعمال سے بہت کم کا بدلہ لے رہے تھے۔" اس نے نرمی سے اس کے کندھے کو چھوا۔

"انتقام کا چکر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ میں دو قبریں کھود کے نکلا تھا، بس میں نہیں چاہتا کہ میرے نام کی قبر میں میری وجہ سے کسی اور کو جانا پڑے۔" اس نے جھرجھری لی۔

"میں نا اب تمہاری چیزوں کی تلاشی لوں گی اگر

مجھے ذرا سی بھی کوکین یا سگریٹ مل گئی تو اچھا نہیں ہو گا۔" وہ غصے سے بولی تھی۔ وہ پھر ہنس دیا۔

"اب فضول باتیں مت کرو' اور کام کرو۔" دھونس سے کہتی وہ اس کے سامنے مزید برتن سرکانے لگی۔ "اور پھر تم نے مجھے اینورسری پہ ڈنر بھی کرانا ہے۔"

"اب کوئی ڈنر نہیں ہوگا۔ آپ نے ان برتنوں کی خاطر موقع مس کردیا۔ سوری!" وہ واپس اپنی جون میں آ کے بولا تھا۔

"ڈنر تو تم مجھے کرواؤ گے' وہ بھی اینورسری والی رات۔ یاد رکھنا۔" نل بند کرتے ہوئے وہ دھمکاتے ہوئے بولی تھی۔ اسے پتا تھا وہ بھی یونہی کہہ رہا ہے' مگر بعد میں ضرور ڈنر پہ لے جائے گا۔

وہ اس رات کو یادگار بنانا چاہتی تھی۔ بہت خوب صورت اور یادگار۔

✡ ✡ ✡

جیتے جی مارتی ہے بے چینی
وہ سکوں ہو عطا کہ مر جائیں

قتل سے دو دن قبل :

سورج کی تپتی گرم شعاعیں اس بلند عمارت کو دہکا رہی تھیں۔ ہاشم اپنے آفس میں تیار سا کھڑا موبائل پہ بات کر رہا تھا۔ سامنے رئیس بیٹھا لیپ ٹاپ پہ لگا تھا۔ بات کرکے ہاشم اس کی طرف آیا۔

"کام صحیح ہو رہا ہے؟"

"جی سر۔ میں ان کے فونز بگ کر رہا ہوں' ریکارڈنگ سن رہا ہوں۔ فارس کی بہت سی آڈیو نکال لی ہے۔ اور Voice modulation کے ذریعے میں اس کو....."

"کوئی کام کی بات معلوم ہوئی یا نہیں؟" اس نے بے زاری سے بات کاٹی۔

"یس سر۔ وہ دونوں فون پہ' فارس اور زمر۔ آج صبح مسلسل ڈنر کا ذکر کرتے رہے تھے۔ وہ کئی دن سے اسے کہہ رہی ہے کہ وہ اسے اینورسری پہ ڈنر پہ لے کر جائے اور وہ بات ٹال دیتا ہے۔"

"گڈ۔ ہم اس کو استعمال کر سکتے ہیں۔" ہاشم نے اس کا شانہ تھپکا اور باہر کی جانب بڑھ گیا۔ راہداری پار کی اور لفٹ میں داخل ہو گیا۔

جس وقت وہ لفٹ سے نیچے لابی میں اترا' سامنے سے آفس بلڈنگ کے استقبالیے کے قریب ہی زمر یوسف آتی دکھائی دی۔ وہ مسکرا کے اسے دیکھتے ہوئے رک گیا۔

"میں کورٹ آرہا تھا' آپ کیا مجھے لینے آگئیں؟"

"نہیں' میں یہ دیکھنے آئی ہوں کہ کہیں آپ ملک سے فرار تو نہیں ہو گئے۔" وہ اسی طرح مسکرا کے بولی. اور لفٹ کے اندر چلی گئی۔ دروازے آپس میں مل گئے تو ہاشم نے موبائل نکال کے نمبر ملایا۔

"حلیمہ..... وہ تمہیں سمن دینے آرہی ہے۔ سعدی کی وکیل۔ تم وہی کرو جو میں نے کہا تھا۔ اوکے گڈ....."

زمر بالائی منزل پہ اتری' اور آگے بڑھتی گئی۔ گھنگھریالے بالوں کو پونی میں باندھے' سیاہ کوٹ پہنے' وہ کورٹ کے لیے مکمل تیار تھی۔ بس حلیمہ کو سمن کی کاپی دینے آئی تھی اور توقع کے مطابق حلیمہ اپنی ڈیسک پہ نہیں تھی۔ اس نے سمن اس کے ایک کولیگ کے حوالے کیا' دستخط لیے' ساتھ میں اپنا کارڈ اور ایک نوٹ بھی دیا' اور لفٹ کی طرف واپس آئی۔ جیسے ہی دروازے کھلے اور وہ اندر داخل ہوئی' کوئی عجلت میں چلتا آیا اور دروازے کے بند ہونے سے قبل اندر آگھسا۔ اس کے ہاتھ میں ایک باکس تھا جس میں چند فائلز' فوٹو فریم اور ایک ننھا سا پودا رکھا تھا۔ کہنی سے اس نے گراؤنڈ فلور پریس کیا اور دروازے آپس میں ملنے لگے۔ تب زمر نے دیکھا' وہ نوشیرواں تھا۔ وہ بھی اسی پل مڑا تو اس کا چہرہ دیکھا۔ زمر رخ موڑ کے کھڑی ہو گئی۔ سنجیدہ اور سپاٹ۔ وہ بھی ایک دم ہچکچا سا گیا۔ لفٹ نیچے اترنے لگی۔

"آپ مجھے ہمیشہ اپنے لیے اسٹینڈ لینے کو کہتی تھیں۔" وہ اسے دیکھ کے آزردگی سے بولا تھا۔

"نوشیرواں! اپنے وکیل کی غیر موجودگی میں آپ کو

مجھ سے بات نہیں کرنی چاہیے۔" وہ بے زاری سے چہرہ پھیرے بولی تھی۔

"مجھے اپنی فیملی کے خلاف آپ نے کھڑا کیا تھا۔ میں سمجھتا تھا آپ مختلف ہیں' شاید آپ کو میرا خیال ہے' مگر۔ آپ بھی ان سب کی طرح ہی نکلیں۔"

"اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ سعدی کو تین گولیاں آپ نے ماری تھیں۔" وہ اس کو دیکھ کے تیزی سے بولی تھی۔

"اور اب میں اپنی غلطیوں کو فکس کر رہا ہوں تو آپ مجھے کورٹ میں پراسیکیوٹ کر کے مجھ سے میرے تمام چانسز چھیننا چاہتی ہیں۔"

"اعمال کے نتائج ہوتے ہیں اور وہ بھگتنے پڑتے ہیں۔ اگر میں سونیا کو تین گولیاں مارتی' تب آپ مجھے کورٹ میں گھسیٹتے یا مجھے مواقع فراہم کرتے؟ کبھی فرصت ملے تو سوچیے گا۔" وہ ایک دم چپ ہو گیا تھا۔ لفٹ نیچے اتر آئی تھی۔ دروازے کھل گئے تھے۔ زمر باہر جانے لگی۔

"مگر میں سب کچھ فکس کرنے کی کوشش کر تو رہا ہوں۔" وہ کرب سے بولا تھا۔

زمر اس کی طرف گھومی۔ اور سپاٹ نظروں سے اسے دیکھا۔

"کیسے؟ استعفیٰ دے کر؟ اپنی کمپنی کی سیاہ کاریاں بتا کر؟ وہ آپ کے دوسرے گناہ ہیں جن سے ہمارا تعلق نہیں ہے۔ سعدی کے لیے کیا کیا آپ نے؟ کورٹ میں اعتراف جرم کر سکتے ہیں؟ نہیں نا۔ ساری دنیا کے سامنے معافی مانگ سکتے ہیں؟ اپنے بھائی کے خلاف گواہی دے سکتے ہیں؟ نہیں نا۔ پھر میں کیسے مانوں کہ آپ کو موقع ملنا چاہیے؟"

سر جھٹک کے وہ آگے بڑھ گئی۔ وہ باکس اٹھائے باہر آیا اور افسوس سے اسے دیکھا۔

"میں سمجھتا تھا آپ کو میری پرواہ ہے۔ صرف آپ کی عزت کرتا تھا میں آپ کے سارے خاندان میں۔ مگر آپ کو میری کوئی پرواہ نہیں ہے۔"

وہ ان سنا کر کے آگے بڑھ گئی۔ لابی میں گزرتے چند لوگوں نے مڑ مڑ کے دیکھا تھا' مگر نوشیرواں کو کوئی فکر نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

گردش وقت مجھے خاک ڈرا پائے گی
تجربے جتنے بڑھیں اتنا ہی ڈر جاتا ہے

وہ سر کے بال خود کر رہے میں نیم اندھیرا تھا۔ تین افراد وہاں موجود تھے۔ کوئی بیٹھا تھا' کوئی ٹہل رہا تھا۔ ایک ارد گرد کی چیزوں کی تلاشی لے رہا تھا۔ سامان بکھرا ہوا سا تھا۔ تکیے' گدا' کھلے دراز۔۔۔ ہر شے الٹ پلٹ کر دی گئی تھی۔ سامنے ایک بیگ کھلا پڑا تھا جس میں سے زیورات' احمر کے پاسپورٹ اور نوٹوں کی گڈیاں جھانک رہی تھیں۔

اور اسی کمرے کے ایک کونے میں بیڈ کی پائنتی کے ساتھ وہ بندھا ہوا دو زانو پڑا تھا۔ شدید تشدد کے باعث اس کی شرٹ پھٹی ہوئی تھی۔ سر سے خون رس رس کر گردن اور کان پہ جم گیا تھا۔ گردن نیچے ڈھلکائے وہ نقاہت زدہ سا بیٹھا تھا۔ دفعتاً" اس نے چہرہ اٹھایا تو اتنا نظر آتا تھا کہ چہرے پہ کوئی زخم وغیرہ نہ تھا۔ پھر اس نے پھٹی ہوئی آواز میں ـــــ ان کو مخاطب کیا۔ "سب کچھ تو لے لیا ہے تم لوگوں نے۔ اب جان چھوڑ دو میری۔"

سامنے کھڑا آدمی اس کی طرف جھکا اور زور کا جھانپڑ اس کے منہ پہ رسید کیا۔

"مزید مال چاہیے۔ بتاؤ کہاں رکھا ہے' ورنہ آج میں تمہیں دفن کر کے سوؤں گا۔" احمر کا چہرہ تھپڑ کے باعث دوسری جانب لڑھک گیا۔ منہ سے کراہ نکلی۔ پھر چہرہ اٹھا کے صوفے پہ بیٹھے آدمی کی طرف دیکھا جو مسلسل فون پہ کسی اجنبی علاقائی زبان میں بات کر رہا تھا۔

"تم مجھے مار نہیں سکتے۔۔۔" گہری گہری سانس لیتے اپنے اندر کے خوف پہ قابو پاتے اس نے بمشکل کہنا چاہا۔ "کیونکہ تم یہ زیور تقسیم نہیں کر رہے۔ جب بھی فیصلے کا وقت آتا ہے۔۔۔ مجھے کیا کھانے کو دینا ہے

مجھے کدھر باندھنا ہے، مجھ سے کیا چاہیے۔۔۔ تم تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہو۔ تم میں کوئی لیڈر نہیں ہے۔ تم میں سے کوئی ان چارج نہیں ہے۔ اس لیے میری بات اس سے کرواؤ جو تمہارا ان چارج ہے۔"

بہ دقت کہہ کے وہ گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

ان تینوں نے پھر سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اب کی بار کوئی اسے مارنے کو نہیں جھکا۔ بس وہ خاموش رہے۔ پھر موبائل والا اٹھا اور باہر نکل گیا۔ احمر گردن جھکا کے پھر سے گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

میز پہ زیورات ابھی تک کھلے پڑے تھے۔ نیم اندھیرے میں بھی وہ جگر جگر چمک رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

اجل خود زندگی سے کانپتی ہے

اجل کی زندگی پہ دسترس کیا

کمرہ عدالت کی اونچی کھڑکیاں تیز دھوپ کے لیے بانہیں کھولے کھڑی تھیں۔ سارا ہال سنہرا روشن نظر آ رہا تھا۔ فارس غازی حسب معمول آخری نشست پہ بیٹھا تھا۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے، وہ عادتاً کان کی لو مسلتے ہوئے کن اکھیوں سے قریب بیٹھے چشمے والے آدمی کو دیکھ رہا تھا، جو سفاری سوٹ میں ملبوس تھا، اور نسوانی انداز میں ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کے بیٹھا تھا۔ فارس نے سر جھٹک کے توجہ سامنے مبذول کرنی چاہی جہاں وہ ادھیڑ عمر ایئرپورٹ سیکیورٹی کنٹرول روم کا آفیسر کٹہرے میں کھڑا تھا۔ زمر اس کے سامنے، چند قدم نیچے کھڑی تھی۔ فارس کی طرف اس کی پشت تھی اور وہ ہاتھ میں کاغذ پکڑے، سنجیدگی سے سوال پوچھ رہی تھی۔

"کیا یہ سچ ہے کہ آپ ۲۴ مئی کی صبح ایئرپورٹ کنٹرول ٹاور میں موجود تھے؟"

"جی ہاں۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ پہلی رو میں بیٹھا سعدی آگے کو جھکا، غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک ایک لفظ پہ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔

"اور کیا آپ نے نوشیرواں کاردار کو ۲۴ مئی کی صبح اسکرین پہ دیکھا تھا؟ یعنی ۲۴ مئی کو کیا وہ ایئرپورٹ پہ موجود تھے؟"

"ایئرپورٹ پہ بہت سے لوگ ہوتے ہیں، مجھے ہر ایک کی شکل یاد نہیں رہتی۔"

"پلیز اپنے جوابات کو ہاں یا ناں تک محدود رکھیں۔ کیا آپ نے نوشیرواں کو دیکھا تھا یا نہیں؟"

"جی نہیں۔" سعدی نے تھک کر سر سیٹ کی پشت سے لگا دیا۔ پھر ذرا سا چہرہ موڑ کے دیکھا تو ہاشم مسکرا کے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ سعدی کے دیکھنے پہ اس نے اپنی فائل کا ایک صفحہ یوں ترچھا کیا کہ سعدی کو اس پہ بڑے بڑے لکھے الفاظ صاف نظر آئے۔

"Money Talks" (پیسہ بولتا ہے) سعدی نے بے زاری سے رُخ پھیر لیا۔

"آپ کو یہ شخص نوشیرواں کاردار اس فوٹیج میں بالکل یاد نہیں؟" زمر سپاٹ سا پوچھ رہی تھی۔ اشارہ سامنے بیٹھے شیرو کی طرف تھا۔

"جی نہیں۔" آپریٹر نے شانے جھٹکے۔

"اور کیا آپ نے اپنے دوست کو کہا تھا کہ کاردارز کے لڑکے کی فوٹیج آپ نے غائب کر دی ہے؟"

"جی نہیں۔ میں ان لوگوں کو جانتا تک نہیں ہوں۔"

"مسعود عالم صاحب۔" زمر نے ایک کاغذ سامنے کیا۔ "یہ تصویر میں نے آپ کے فیس بک سے لی ہے، اس میں کیا یہ آپ ہی ہیں؟"

مسعود نے جھک کے تصویر دیکھی۔ "جی۔"

"اور ساتھ میں کون ہے؟"

"یہ حمزہ علی عباسی ہیں۔"

"آب جیکشن یور آنر۔" ہاشم نے بیٹھے بیٹھے پکارا۔ "فین فوٹوز کا اس اہم گواہی کے درمیان ذکر کرنا؟"

"اوور رولڈ" مگر مسز زمر آپ کنکشن جلد واضح کریں، ورنہ عدالت کا وقت ضائع نہ کریں۔" جج

صاحب نے اسے تنبیہہ کی۔ زمر نے سر کو خم دیا اور چند مزید تصاویر سامنے کیں۔ "یہ آپ کے ساتھ چند دوسری مشہور شخصیات کی تصاویر ہیں۔ یہ قمر الزمان کائرہ ہیں' یہ راحت فتح علی خان ہیں اور یہ۔۔۔؟"

"مصباح الحق۔" مسعود عالم نے بتایا۔ زمر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو آپ جب بھی کنٹرول روم میں بیٹھے اسکرین پہ ایئرپورٹ پہ کسی شناسا چہرے کو دیکھتے ہیں' تو کوشش کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ تصویر لے لیں۔"

"جی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ اسکرین کو غور سے دیکھتے ہیں' اور کوشش کرتے ہیں کہ کوئی چہرہ Unnoticed نہ رہے۔"

"جی ہاں' یہ میرا فرض ہے۔"

"مگر آپ کو نوشیرواں کاردار نہیں یاد؟ نہ ۲۲ مئی کو' نہ ۲۱ مئی کو۔"

"جی نہیں۔"

"کیونکہ ان سیلبریٹیز کو آپ پہچانتے تھے مگر نوشیرواں کو نہیں۔"

"جی بالکل۔" وہ اعتماد سے بولا۔

"اور آپ نے کبھی اس سے پہلے نوشیرواں کو نہیں دیکھا تھا؟"

"جی نہیں۔"

"اور آپ ان کے نام تک سے واقف نہیں تھے؟"

"جی نہیں۔ میرا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"مسعود صاحب' کیا یہ درست نہیں ہے کہ آج سے ڈھائی سال پہلے ایک رات نوشیرواں کاردار کی تصویر اور پاسپورٹ کی کاپی ہاشم کاردار نے ایئرپورٹ کے عملے کو بھیجی تھی؟" اس کے سوال پہ فارس قدرے دلچسپی سے آگے ہوا۔

"آبجیکشن یور آنر۔" ہاشم تیزی سے اٹھا مگر جج صاحب نے اسے واپس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"بات جاری رکھیں۔" زمر نے تشکر سے سر کو خم دیا اور اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"یہ اس ای میل کی کاپی ہے جو تین مختلف آفیسرز نے ہمیں فراہم کی ہے۔ یہ وہ رات ہے جب مبینہ طور پہ نوشیرواں اغوا ہوا تھا کوریا میں' اور ہاشم نے یہ تصویر اور پاسپورٹ کی کاپی بہت سے آفیسرز کو بھیجی تھی تاکہ جیسے ہی یہ شخص واپس پاکستان آئے' اسے فوراً اطلاع کی جائے۔ اس ای میل کے ہیڈر میں بہت سے پتے لکھے ہیں۔ یہ آپ کی ای میل کا پتا ہے نا؟" اس نے کاغذ اس کے سامنے کیا۔

"جی مگر۔۔۔"

"اور یہ آپ کا جواب ہے جو آپ نے ریپلائی آل کلک کر کے دیا تھا جس میں لکھا ہے "Sir' it On" یوں یہ جواب سب کو چلا گیا تھا۔"

"مجھے۔۔۔ یاد نہیں۔" اس نے پست آواز میں کہا۔

"آپ کے ای میل ریکارڈ کو سب ذرہ ذرہ یاد ہے۔ اس کا مطلب ہے' آپ نے وہ ای میل کھولی تھی' اور آپ نے نوشیرواں کا نام بھی سنا تھا' اور شکل بھی دیکھی تھی۔"

"دیکھیں' اس بات کو کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ مجھے یاد نہیں تھا۔" وہ سنبھل کر بولا۔

"کیا آپ اس شوٹنگ کلب کے ممبر ہیں؟" اس نے ایک کارڈ کی کاپی اس کے سامنے رکھی۔

"جی۔"

"اور آپ تقریباً ہر ہفتے وہاں جاتے ہیں۔"

"جی ہاں۔ تقریباً۔"

"تو کیا آپ نے اس کی لابی میں سال کے بہترین شوٹرز کی تصاویر اور نام نہیں دیکھے؟ پچھلے دو سال سے نوشیرواں کاردار دوسرے نمبر پہ آ رہے ہیں' ان کی تصویر وہاں نمایاں لگی ہے' جسے آپ ہر ہفتے دیکھتے ہیں۔ تو پھر مجھے صرف اتنا بتائیے کہ آپ نے نوشیرواں کو اسکرین پہ مس کر دیا' یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے مگر آپ کا حلف کے تحت یہ کہنا کہ آپ نے اسے کبھی دیکھا نہیں ہے' یہ ناقابل فہم ہے۔ مجھے مزید کوئی سوال نہیں

پوچھنا۔" وہ سختی سے کہہ کر پلٹ آئی۔

ہاشم نے جھک کر ساتھ بیٹھے نوجوان وکیل سے سرگوشی کی۔ "ڈیڈیو بنائی؟"

"جی سر۔ اب حلیمہ کو بھیج رہا ہوں۔ اسے اندازہ ہو جائے گا کہ یہ کیسی وکیل ہے اور اسے کیسی تیاری کرنی ہے۔" ہاشم سر کو خم دے کر اٹھا۔

"مسعود صاحب! آپ روز کتنے لوگوں کو سی سی ٹی وی فیڈ کی اسکرینز پہ دیکھتے ہیں؟"

"سینکڑوں۔"

"اور کیا صرف ایک اسکرین کو دیکھنا ہوتا ہے آپ کو؟"

"نہیں، سر بہت سے مانیٹرز ہوتے ہیں۔"

"اور ایگزٹ کنٹرول لسٹ کے لیے وزارت داخلہ سے اور اس کے علاوہ پولیس اور دیگر ایجنسیز کی طرف سے ریڈ الرٹ کے طور پہ ایک ماہ میں کتنی تصاویر آپ کو بھیجی جاتی ہیں؟" وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"کم سے کم بھی ہو تو دو سو سے اوپر۔"

"جب میں نے وہ تصویر ایئرپورٹ بھیجی، صرف اس لیے کہ میرے بھائی کو آنے میں تاخیر ہو گئی تھی' نہ کہ وہ اغوا وغیرہ ہوا تھا' تو اس واقعے کو آج کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟"

"ڈھائی سال۔"

"اور سعدی یوسف کے اغوا کے وقت اس بات کو قریباً" ڈیڑھ سال گزر چکا تھا۔"

"ایسا ہی ہے۔"

"اور اس ڈیڑھ سال کے دوران آپ نے دو ہزار تصاویر بطور الرٹ دیکھی ہوں گی۔"

"اس سے بھی زیادہ۔" آپریٹر اعتماد سے مسکرایا تھا۔

"تو کیا اسی لیے آپ کے لیے دیکھے ہوئے چہرے کو بھی یاد رکھنا مشکل ہے۔"

"آب جیکشن یور آنر۔ گواہ سے رائے بھی مانگ رہے ہیں کاردار صاحب اور ان کو لیڈ بھی کر رہے ہیں۔" وہ بے زاری سے بولی تھی۔

"Sustained" جج صاحب کی رولنگ کے بعد ہاشم سر جھٹک کے اب سوالات کا رخ موڑ کر عصمت بی بی کی طرف لے آیا۔ ذاتی عناد' پروفیشنل جیلسی وغیرہ وغیرہ اور مسعود صاحب اب اعتماد سے بتا رہے تھے کہ یہ خاتون پہلے کتنے لوگوں کے ساتھ ایسا کر چکی ہے۔

سماعت کے بعد زمر باہر آئی تو فارس دروازے کے ساتھ اس کا منتظر کھڑا تھا۔ چہرے پہ حیرانی' اور قدرے اچنبھا سا تھا۔ وہ فائلز سینے سے لگائے آگے بڑھنے لگی تو وہ جلدی سے اس کے پیچھے لپکا۔

"تمہیں اس کی ای میلز کا کیسے پتا چلا؟ اور تم نے ایئرپورٹ کے اتنے سارے لوگوں سے ان کے ایفی ڈیوٹ اور ای میلز کیسے لیں؟" وہ واقعی متحیر تھا۔

"اسے oppo research کہتے ہیں' اور چونکہ میں وکیل ہوں تو مجھے وہ کرنی آتی ہے۔" وہ مسکراہٹ دبائے چلتی جا رہی تھی۔

"مگر تمہیں کیسے پتا کہ وہ بھی اسی کلب کا ممبر ہے جہاں نوشیرواں بھی جاتا ہے؟"

"کیونکہ میں ایک اچھی وکیل ہوں۔ تم کیا مجھ سے متاثر ہو رہے ہو؟"

اس کے ساتھ چلتے فارس کے چہرے کے زاویے بگڑے۔ لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

"ابھی وہ وقت نہیں آیا۔ میں تو یوں ہی پوچھ رہا تھا۔"

زمر نے چہرہ موڑ کے مسکرا کے اسے دیکھا۔ "میری زندگی میں وہ وقت پتا نہیں آئے گا بھی یا نہیں۔"

"مجھے تو آثار نظر نہیں آ رہے۔" وہ بھی مسکراہٹ دبا کے بولا تھا۔

"ماموں!" سعدی پیچھے سے پکارتا ہوا آ رہا تھا۔

فارس نے پلٹ کے اسے دیکھا۔

"کیا ہوا؟ پریشان لگ رہے ہو؟"

"یہ احمر شفیع کہاں ہے؟ فون آف ہے اس کا اتنے دن سے۔" وہ جھنجلایا ہوا بھی تھا۔ فارس کی نظروں کے سامنے وہ بیگ' زیور' پاسپورٹ گھوم گئے۔ اس

نے گہری سانس لی۔

"وہ کہیں شہر سے باہر گیا ہوا ہے لمبے عرصے کے لیے۔ اس کو تنگ مت کرو۔"

"ایسے کیسے چلا گیا؟ میرے ساتھ اتنے کام کرنے تھے اس کو۔"

"اس کے پیچھے مت پڑو اس کو اپنی مرضی سے جانے دو۔" زمر نے بھی نرمی سے کہا تھا۔

سعدی شش و پنج میں مبتلا کھڑا رہ گیا اور وہ دونوں آگے بڑھ گئے۔ پتا نہیں کیوں، وہ مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا۔ احمر کچھ بھی کر سکتا تھا، مگر جتنا سوشل وہ تھا، وہ اپنا فون اور واٹس ایپ یوں بند نہیں کر دیتا تھا۔ اب وہ کیا کرے؟

☼ ☼ ☼

یہ مری عمر کا صحرا مرے دجلوں کا سراب
سبزۂ مژگاں نہ رہے گا تو کدھر جائے گا

وہ ایک گرم صبح تھی۔ حبس آلود، گھٹن زدہ۔ فضا میں ان دیکھی سی نمی تھی۔ جیسے کوئی خاموش آسیب ناک میں بیٹھتا ہے اور دلوں کی دھڑکن سنتا رہتا ہے۔ مورچال کے پورچ میں اندر سے اڑ اڑ کے آتی ناشتے کی اشتہا انگیز خوشبوئیں محسوس ہو رہی تھیں۔ زمر اپنی کار کا دروازہ کھولے کھڑی تھی۔ کوٹ پہنے، پرس کاندھے پہ ڈالے، تیار اور مصروف سی اور بس آخری منٹ میں گویا فارس کو ہدایات دے رہی تھی۔

"گھر جلدی آنا۔ پھر تم نے مجھے ڈنر پہ لے کر جانا ہے۔"

"اینیورسری کل ہے مادام، اور جہاں تک ڈنر کا تعلق ہے تو کل حسینہ بنائے گی نا کدو گوشت۔" وہ سادہ سی شرٹ پہنے، جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا، ہشاش بشاش سا مسکراتا کہہ رہا تھا۔

"کیا ہم آج رات بارہ بجے نہیں سیلیبریٹ کر سکتے؟" وہ خفا ہوئی۔

"کس چیز کو سیلیبریٹ کرنا ہے؟ آپ نے مجھ سے انتقام کے لیے میری زندگی کو جہنم بنانے کی نیت سے جو عقد کیا تھا اس کو سیلیبریٹ کرنا ہے کیا؟"

"نہیں، تمہاری دولت اور اس شاندار جاب کو سیلیبریٹ کرنے کے لیے جس پہ تم روز جاتے ہو اور جس کے لیے میں نے تم سے شادی کی تھی۔" وہ جل کر بولی تھی۔ وہ دھیرے سے ہنس دیا۔ گرم صبح بھی خوشگوار لگنے لگی تھی۔

"میں تمہیں کسی ڈنر پہ نہیں لے جا رہا۔ تم نے موقع ضائع کر دیا مجھ سے برتن دھلوا کے۔" ابھی وہ اور بھی کچھ کہتا جب گیٹ کے باہر ٹائر رگڑ کر رکنے کی آواز آئی۔ وہ دونوں چونکے۔ ایک کار رکی، دروازے کھلے اور پھر بیل بجی۔ فارس آگے آیا اور دروازہ کھولا۔

"شہرین!" وہ اسے دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ زمر نے اس کے کندھے کے پیچھے سے جھانکا۔ باہر شہری کھڑی تھی۔ باب کٹ سنہرے بالوں کو کھلا چھوڑے، گلے میں اوٹ پٹانگ مالائیں ڈالے، ایک کان میں بالی پہنے، دوسرا کان خالی، وہ ہیجان کا شکار نظر آتی تھی۔ اسے دیکھ کر بے چینی سے بولی تھی۔

"فارس! تم میرے لیے کیا کرو گے اگر میں تمہارے کیس میں تمہاری مدد کروں؟"

"وعلیکم السلام شہری! مجھے بھی تم سے مل کے بہت خوشی ہوئی۔" وہ تحمل مگر غور سے اسے دیکھ کے بولا تھا۔

"مجھے کسی ایک سائیڈ پہ ہونا ہے کیونکہ جلد ہی گواہی کے لیے بلائی جاؤں گی۔ اس لیے مجھے بتاؤ، تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو؟"

شہرین نے اس کی بات کو نظر انداز کیا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتے ہوئے سوچتا رہا۔

"یہ منحصر ہے اس پہ کہ تمہارے پاس کیا ہے۔"

"نوشیرواں کا لائسنس، جو اس کی گلاک گن کا ہے۔"

فارس کے ابرو بے یقینی سے اٹھے، اس نے مڑ کے زمر کو دیکھا جو اسی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔

"اندر آجاؤ۔"

"تمہارا گھر وائرڈ ہو سکتا ہے، میں خطرہ مول نہیں

لے سکتی۔ تمہیں باہر آنا ہوگا۔"

"اوکے۔" اس نے ایک نظر زمر پہ ڈالی۔ اس وقت کی ایک آخری نظر۔ اور باہر نکل گیا۔ زمر اسے جاتے دیکھتی رہی۔ اس کا دماغ گلاک گن میں اٹکا ہوا تھا، مگر دل فارس میں۔ ابھی وہ اس پہ خفا ہو رہی تھی، مگر ایک دم وہ گھر سے گیا تو لگا جیسے سب کچھ خالی ہو گیا ہے۔ کاش وہ نہ جائے، آج کا دن اس کے ساتھ گزارے، مگر او نہوں۔ وہ سر جھٹکتی واپس کار کی طرف آئی۔

"وہ ضروری کام سے گیا ہے' اتنا خود کو کسی کا عادی نہیں کرنا چاہیے زمر بی بی!" خود کو دل میں پکارا اور خود ہی ہنس دی۔ (زمر بی بی؟ واو!)

☆ ☆ ☆

بندہ پرور جو ہم پہ گزری ہے
جو ہم بتائیں تو کیا تماشا ہو

سورج سوا نیزے پہ تھا جب سعدی ان فلیٹ بلڈنگ کی لفٹ میں داخل ہو رہا تھا۔ ساتھ میں گردن ادھر ادھر گھما کر اندازہ بھی کر رہا تھا کہ درست جگہ پہ ہے یا نہیں۔ عمارت تو یہی تھی' فلیٹ نمبر بھی اسے کچھ کچھ سا یاد تھا۔ فلور کے بارے میں وہ قدرے متذبذب تھا۔ پھر اندازے سے ایک بٹن پہ انگلی رکھی تو لفٹ کے دروازے بند ہونے لگے۔

مطلوبہ فلور پہ اتر کے وہ غیر شناسا نظروں سے اطراف میں دیکھتا آگے آیا۔ پودا' راہداری' فلیٹ کا دروازہ۔ غالباً "یہی تھا احمر کا فلیٹ" مگر مسئلہ یہ تھا کہ یہاں ہر فلور ایک سا لگتا تھا۔ ایک سے پودے۔ ایک سے دروازے۔ خیر۔ وہ آگے آیا اور دروازے کے ساتھ لگی بیل بجائی۔ پھر سر پہ جمی پی کیپ درست کرتا ذرا ہٹ کے کھڑا ہو گیا' تاکہ دروازے کے سوراخ سے دیکھنے والا اس کا چہرہ نہ دیکھ سکے۔ (شاید احمر اس کو avoid کر رہا ہو تو کم از کم یوں وہ کسی اور کے دھوکے میں دروازہ تو کھول دے گا۔)

اندر فلیٹ نیم اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ صرف کمرے کی بتی جل رہی تھی جس میں وہ تین آدمی اس کے سر پہ کھڑے تھے۔ وہ ہنوز بندھا ہوا نیچے بیٹھا تھا' اور سر نیہوڑا رکھا تھا۔ گھنٹی کی آواز پر سب چونکے۔ احمر نے بھی سر اٹھایا۔ وہ پہلے سے زیادہ نقاہت زدہ دکھتا تھا۔

"ارے اس وقت کون آگیا؟ ہاں؟ بول۔" ان کے سرغنہ نے اس کو بالوں سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔

"جا کر خود کیوں نہیں دیکھ لیتے؟" وہ تلخی سے بولا تھا تو اس نے جھٹکے سے اس کے سر کو چھوڑا۔ پھر باہر نکل گیا۔ چند لمحوں بعد واپس آیا۔

"کوئی آدمی ہے' شکل نہیں دکھائی دے رہی۔ اس طرف منہ کر کے کھڑا ہے۔ سر پہ کیپ پہن رکھی ہے۔" اس نے موبائل پہ میجک آئی سے تصویر بنالی تھی اور اب احمر کو دکھا کے پوچھ رہا تھا۔ "کون ہے یہ؟"

احمر نے ایک بے نیاز نظر تصویر پہ ڈالی۔

"یہ؟ یہ تو پزا والا ہے۔ اس کے اوت لٹ کا بل دینا تھا مجھے۔ دو ہزار روپے۔"

پھر سے گھنٹی بجی۔ تیز چنگھاڑتی آواز۔ تینوں نے باری باری ایک دوسرے کو دیکھا۔

"خود ہی تھک کے چلا جائے گا۔ بجانے دو گھنٹیاں۔" ایک نے مشورہ دیا۔

"ویسے بھی کوئی اور تو اس کے پاس آتا جاتا نہیں ہے' سو کسی کو شک نہیں ہوگا۔"

"اور ہم نے اس کو یہیں رکھنا ہے' یہاں سے لے جا بھی نہیں سکتے۔" ان کی مدھم آوازیں احمر شفیع کو سنائی دے رہی تھیں۔

"میری کار بار کنگ میں کھڑی ہے۔ اس پزا بوائے نے وہ دیکھ لی ہوگی۔ اسے پتا ہے کہ میں گھر پہ ہوں۔ اس نے اپنی طرف سے پیسے دے کر کھانے میں غلط اعداد و شمار لکھے تھے' اور اب وہ پیسے لیے بغیر نہیں جائے گا۔ دروازہ نہ کھولا تو پارکنگ میں جا کر میری کار کے شیشے توڑ دے گا' نتیجتاً" گارڈز اوپر مجھے بلانے آئیں گے' پھر کیا کرو گے تم لوگ؟"

”چپ کر کے بیٹھو۔“ ایک غرایا تھا۔

”میرے ہاتھ کھولو اور مجھے دو ہزار روپے دو' تاکہ میں اسے پکڑا کے چلتا کروں۔ مجھے پتا ہے تم لوگوں نے مجھے مارنا نہیں ہے۔ اور تمہارے مالک سے ملنے کا مجھے خود بھی کافی شوق ہے تو میں نہیں چاہتا کہ تم لوگ پکڑے جاؤ۔ میرے ہاتھ کھولو' میرا منہ دھلواؤ' تاکہ میں اس کو چلتا کروں۔“ ان تینوں نے پھر سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ گھنٹی ہنوز بج رہی تھی۔

چند منٹ بعد دھلے چہرے والا احمر دروازے کے ساتھ کھڑا تھا' اس کے ہاتھ میں ہزار ہزار کے دو نوٹ تھے اور اس کی پشت سے ایک آدمی نے پستول کی نال لگا رکھی تھی۔ اندر کی ساری بتیاں بجھادی تھیں' تاکہ وہ دروازہ کھولے تو باہر والا اندر نہ جھانک سکے۔

”پہلے پوچھو کہ کون ہے' اور کوئی چالاکی مت کرنا۔“ وہ ابھی تک مشکوک تھا۔ احمر نے گہری سانس لی اور کھنکھار کے آواز لگائی۔

”اے..... بڑا بوائے ہو نا؟“

”ہاں جی' بڑا بوائے ہوں۔ اب دروازہ کھولو۔“ وہ خفگی سے بولا تھا۔ احمر نے فاتحانہ نظروں سے اغواکار کو دیکھا اور پھر آگے بڑھا۔ دروازہ ذرا سا کھولا اور سر باہر نکالا۔ سامنے سعدی کھڑا تھا۔

”مرے کیوں جا رہے ہو دو ہزار روپے کے لیے؟ گھنٹی بجا بجا کے دماغ خراب کر دیا ہے میرا۔ دو پڑے کیا منگوا لیے' تم لوگ تو جان کو آجاتے ہو۔ یہ پکڑو۔“ غصے سے بولتے اس کے ہاتھ میں نوٹ تھمائے۔

سعدی ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔

”خبردار جو اب گھنٹی بجائی۔ دفع ہو جاؤ ادھر سے۔ اور اگر اب دروازہ بجایا' تو کان کھول کر سن لو' میں سیکیورٹی والوں کو بلا لوں گا۔“

”کیا..... کیا.....؟“ وہ سنبھل کے کچھ بول بھی نہ پایا تھا کہ احمر نے اس کے منہ پہ دروازہ بند کر دیا۔ سعدی نے بے اختیار دروازہ بجایا۔ ”احمر..... ایک منٹ میری بات سنو۔“

”دفع ہو جاؤ' خاور' ورنہ میں سیکیورٹی کو بلا لوں گا۔“ وہ حلق پھاڑ کے چلایا تھا۔ سعدی کا ہاتھ رک گیا۔ ساکت۔ شل۔ (خاور؟) وہ چند لمحے کھڑا ہاتھ میں پکڑے نوٹ دیکھتا رہا' پھر شل سا پلٹ گیا۔

ان کا سرغنہ میجک آئی سے باہر جھانک رہا تھا۔ وہ چلا گیا تو اسے سکون ملا۔ وہ واپس مڑا اور احمر کے ہاتھ پیچھے باندھ کر ہتھکڑی لگانے لگا۔ احمر نے کوئی مزاحمت نہیں کی' خاموشی سے خود کو بندھوا تا رہا۔

سعدی اسی شل سی کیفیت میں سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ لفٹ کے بجائے وہ زینے سے جا رہا تھا' جانے کیوں۔ بار بار الجھ کر احمر کے الفاظ پہ غور کرتا۔ شاید اندر کوئی لڑکی ہو' اور وہ اسے بھگانا چاہ رہا ہو۔ مگر بڑا بوائے..... جب پہلی بار ادھر آیا تھا تو احمر اسے بڑا بوائے سمجھا تھا۔ آج برسوں بعد اس لقب سے پکارا تھا۔ مگر ”خاور؟“ اور ”یہ نوٹ“۔ اس نے وسط سیڑھیوں پہ رک کر ان دو نوٹوں کو دیکھا۔ وہ لپٹے ہوئے تھے۔ اس نے ان کو کھولا۔

دونوں نوٹوں کے درمیان..... تازہ خون لگا تھا۔ بالکل تازہ سرخ بوندیں۔ سعدی یوسف سناٹے میں رہ گیا۔

اوپر اب وہ احمر شفیع کو اندھیرے لاؤنج سے گزار کے روشنی والے کمرے میں لے جا رہے تھے۔ جیسے ہی وہ اندر آیا' روشنی میں اس کے ہاتھ کی پشت عیاں ہوئی' جس پہ ایک کٹ لگا تھا (جو اس نے اندھیری راہداری میں دروازے کے لاک کے ساتھ رگڑ کے لگایا تھا) اور یہاں پہنچنے تک اس کو مسلسل دوسرے ہاتھ سے دبا کر رکھنے کے باعث اس سے خون رس رس کر گیا تھا۔ زائد خون وہ کپڑوں سے رگڑ کر صاف کر چکا تھا اور جس لمحے ان تینوں نے اسے واپس بیڈ کے قریب باندھا' اس کے ہاتھ پہ ان کو ایسا کچھ نہ دکھائی دیا' جو ان کو کسی شک میں ڈالتا۔ اب وہ ٹولی کی صورت کھڑے باتیں کر رہے تھے' اگلا لائحہ عمل طے کر رہے تھے' اور احمر خاموشی سے بیٹھا وال کلاک کو دیکھ رہا تھا۔ گھڑی لحہ بہ لحہ وقت کو گن رہی تھی۔ ٹک ٹک..... ٹک ٹک.....

☆ ☆ ☆

کیا بہاروں نے' نئے عہد کی دستک دی ہے!

شہپاروں کی خزاؤں کا سحر جاتا ہے

اس چھوٹے سے آفس کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ کمپیوٹر کے سامنے ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا ماؤس چلا رہا تھا اور فارس اس کے کندھے پہ جھکا اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ شہرین دوسری طرف کھڑی تھی۔

"ملا کچھ؟" وہ بے چینی سے بولی تو فارس نے سنجیدگی سے اسکرین کو دیکھتے، گردن دائیں بائیں ہلائی۔ "نوشیرواں کے نام سے کوئی ریکارڈ نہیں آ رہا۔"

"ہاشم کاردار کے نام سے کچھ کنز آ رہی ہیں میڈم۔" آفیسر نے اطلاع دی۔

"نوشیرواں کا ریکارڈ وہ مٹا چکے ہوں گے۔ جب ہمیں اتنی آسانی سے منسٹری کے ڈیٹا بیس تک ایکسس مل گئی ہے، تھینکس ٹو یور فادر شہری، تو ان کو بھی مل گئی ہوگی۔" فارس افسوس سے کہتا سیدھا ہوا۔ "تمہارا شکریہ مگر وہ ریکارڈ مٹا چکے ہیں۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"ہارڈ کاپیز کہاں ہوتی ہیں؟" شہری نے افسر کو سوچتے ہوئے مخاطب کیا۔

فارس ایک دم چونکا۔ "ہاں واقعی، ہارڈ کاپیز کا ریکارڈ تو ہوگا نا۔"

"وہ تو میم..." وہ ذرا ہیجان سے بولا۔ "ایک دوسری بلڈنگ میں ہیں، اور وہاں آپ کو میں یوں نہیں لے کر جا سکتا۔" شہری نے تندہی سے اسے گھورا اور پرس کھولا۔ چند گلابی کڑک نوٹ نکالے اور اس کے سامنے میز پہ ڈالے۔

"ہمیں وہ فائل چاہیے، اس لیے اب تم ہمیں اس بلڈنگ میں لے کر جاؤ گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے میم، مگر..." اس نے دھیرے سے نوٹ اٹھائے۔ "شفٹنگ کے دوران فائلز کو ڈبوں سے نکال لیا گیا تھا۔ ان کی کوئی ترتیب نہیں ہے۔ اتنے بڑے تین کمرے فائلز سے بھرے ہوئے ہیں۔ دیکھنے میں پورا دن لگ جائے گا۔"

"یعنی اگر ہاشم نے وہ فائل نکالنی ہوتی تو اسے بھی کئی بندے لگا کے کئی گھنٹے کام کروانا پڑتا۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ اتنا خوار کون ہو اور صرف سافٹ کاپی مٹانے پہ اکتفا کیا ہو۔" وہ سوچتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ شہری کی آنکھوں میں چمک ابھری۔

"یعنی فائل مل جانے کے چانسز زیادہ ہیں۔ گڈ۔ فاروق ہمیں ادھر لے چلو۔ چلو نا، اب شکل کیا دیکھ رہے ہو؟" شہری نے آنکھیں دکھائیں تو وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

"سنو۔" پھر وہ اس کے قریب آئی۔ "اگر لائسنس ڈھونڈ دیا میں نے تمہیں تو تم بھی میرا ایک کام کرو گے، اچھا۔" اسے یاد دلایا۔ فارس نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔ "پہلے لائسنس مل جائے پھر دیکھتے ہیں۔"

☆ ☆ ☆

ہوا کی زد پہ ... ہمارا سفر ہے کتنی دیر
چراغ ہم کسی شام زوال ہی کے تو ہیں

مور چال پہ رات اتر آئی تھی۔ حنین یہ تسلی کرنے کے بعد کہ امی سو چکی ہیں، اور اب اس کو ڈانٹ نہیں سکتیں، اپنی الماری سے وہ سارا سامان نکالنے لگی جو اسٹینسل پینٹ کرنے کے لیے اسے چاہیے تھا۔ صبح یا تو امی لاؤنج کی دیوار پہ ایک خوب صورت شاہکار دیکھیں گی یا صرف "شاہکار"! تب تک جو بھی ہو، وہ اپنا کام اچھا یا برا کر چکی ہوگی۔ بہت جوش سے چیزیں اکٹھی کرتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

زمر اپنے کمرے میں بیٹھی کام کر رہی تھی۔ گاہے بگاہے فون اٹھا کے دیکھ لیتی۔ فارس صبح کا گیا ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ وال کلاک پہ سیکنڈ والی سوئی ٹک ٹک کرتی آگے بڑھ رہی تھی۔

باہر حنین اب اسٹینسل کے خاکے کو دیوار پہ چپکا رہی تھی۔ اس کی خالی جگہوں پہ اسے رنگ بھرنا تھا۔

فارس ایک نیم تاریک آفس میں کھڑا تھا۔ بتیاں بند تھیں، اور وہ الماری سے فائلوں کا گٹھا نکال کے زمین پہ رکھ رہا تھا۔ قریب میں اسٹول پہ بیٹھی شہری فائلوں

کے ڈھیر میں الجھی ہوئی تھی۔ وہ افسر بھی ساتھ بیٹھا ایک ایک صفحہ کھول کے دیکھ رہا تھا۔ بتیاں بند تھیں اور وہ تینوں پنسل ٹارچز کی مدد سے کام کر رہے تھے۔ فضا میں گرد اور گھٹن تھی۔ سست روی تھی۔ وقفے وقفے سے شہری کھانستی پھر ناک رگڑتی اور کام کرنے لگ جاتی۔

احمر شفیع کے اپارٹمنٹ بلڈنگ کے باہر کار میں موجود سعدی خاموش سا بیٹھا تھا۔ بالکل چپ۔ جیسے کسی کا منتظر ہو۔

اوپر فلیٹ میں وہی گھٹن زدہ ماحول چھایا تھا۔ اغوا کاروں کا ایک کارندہ دوسرے سے بے چینی کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ "اسے پنڈی والے گودام لے چلتے ہیں سیہ نہ ہو کہ کوئی اور آجائے اس کا پوچھنے۔"

"نہیں' اس کو کہیں نہیں لے کر جانا۔ باہر موو کرنے میں بہت خطرہ ہے۔ یہیں کرنا ہے جو کرنا ہے۔"

نیچے بندھے احمر کی نظریں ہنوز گھڑی پہ جمی تھیں۔ دل بھی اسی آواز کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔ ہر گزرتے سیکنڈ پہ ایک دفعہ ڈوب کر ابھرتا۔ کیا کوئی آئے گا اس کی مدد کے لیے؟ کیا سعدی سمجھ پائے گا؟ یا وہ بے نام و نشان یہیں مرجائے گا؟

مور چال کے لاؤنج میں حنہ اسٹول پہ کھڑی دیوار پہ پینٹ کر رہی تھی ۔۔۔ آہٹ پہ چونکی۔ تیار سی زمر کمرے سے نکل رہی تھی۔ حنہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"آپ اس وقت کس کی شادی میں جارہی ہیں؟"

"اپنی شادی کی اینورسری میں جارہی ہوں۔"

"کل بیس مئی ہے؟ ایک سال ہوگیا؟"

"کل نہیں۔ ابھی بارہ بجے سے بیس مئی ہے اور فارس صاحب کو اتنے دن سے ڈنر ڈنر کرنے کے بعد بالآخر آج وقت مل ہی گیا مجھے ڈنر پہ بلانے کا۔"

حنہ کی آنکھیں چمکیں۔ "کہاں بلایا ہے؟"

"ہم دونوں کے لیے ایک یادگار جگہ ہے وہ۔ زیادہ سوال مت پوچھو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"ویسے ان کو چاہیے تھا آپ کی مرضی کی جگہ پہ لے کر جاتے آپ کو۔ ٹیبل ریزرو کر کے بتا رہے ہیں اب۔"

"وہ تو گواہ کو ملوانے کا بہانہ کر کے بلا رہا ہے۔ مگر اکیلے آنے کا کہا' اور وہ بھی بیس مئی کی رات۔ ظاہر ہے وہ مجھے سرپرائز دینا چاہتا ہے۔ اوکے اللہ حافظ۔" وہ مسکرا کر اس کو الوداع کہتی باہر کی طرف بڑھ گئی۔ حنین کے دل نے تمنا کی کاش کہ وہ آج پھر چابیاں بھول جائے اور واپس آئے' مگر وہ عجلت میں تھی۔ خیر' حنہ سر جھٹک کر کام کرنے لگی۔

اندھیرا بھرے آفس میں وہ تینوں زمین پہ بیٹھے فائل پہ فائل چیک کیے جارہے تھے' جب فارس نے جیب سے موبائل نکالا۔ نو سگنل۔ شاید یہاں جیمر لگے تھے۔ وہ موبائل واپس ڈال کے کام کرنے لگا۔

چند لمحے گزرے تھے جب شہری کا موبائل بجا۔ سر جھکائے کام کرتے فارس کے ہاتھ بالکل تھم گئے۔

"ہاں ٹھیک ہے' تم اس کو دوا دے دو اور......" سونی کو بخار تھا اور وہ فون پہ ملازمہ کو ہدایت دے رہی تھی۔ فون کان اور کندھے کے درمیان لگائے' وہ ساتھ ہی فائل کے صفحے بھی الٹ رہی تھی۔ فارس دم سادھے بیٹھا رہا۔ شہری نے فون بند کیا تو فارس نے اپنی جیب سے موبائل نکال کر پھر دیکھا۔ "نو سگنل۔"

اب کی بار اس نے نظریں اٹھائیں تو وہ مختلف نظریں تھیں۔ غور سے چبھتے ہوئے انداز میں شہری کو دیکھا۔ "تم بہت سست روی سے کام کر رہی ہو۔ جلدی ہاتھ چلاؤ۔" بظاہر مصروف سے انداز میں بولا تھا۔ شہری "کر تو رہی ہوں' ڈسٹ بہت ہے" کہہ کر نزاکت سے کھانسی' اور پھر اگلی فائل اٹھالی۔

وہ فائلز اٹھائے کھڑا ہوا اور دروازے کے ساتھ نصب الماری کے سامنے جارکا۔ فائلز اندر رکھیں اور یونہی الماری میں سر گھسائے چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگا۔ کن انکھیوں سے وہ دونوں کو دیکھ بھی رہا تھا۔ شہری کی اس طرف پشت تھی' البتہ آفیسر بھی ادھر جاتا' کبھی

ادھر۔ ساتھ ہی بار بار کلائی کی گھڑی پہ بھی ٹارچ مارتا۔ شہری کے ہاتھ بھی سست روی سے چل رہے تھے دونوں کسی کا انتظار کررہے تھے۔ مگر کس کا؟

وہ چند ثانیے الماری میں سر دیے کھڑا رہا۔ جیسے ہی اس نے دیکھا کہ آفیسر کی اس طرف پشت ہوئی ہے' وہ سرعت سے پیچھے ہٹا اور کھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ بنا چاپ پیدا کیے وہ راہداری عبور کرکے زینے کی طرف لپکا۔ جوتے اتار کے ہاتھ میں پکڑ لیے اور تیز تیز سیڑھیاں اترنے لگا۔ دل دھک دھک کررہا تھا۔ ماتھے پہ پسینہ تھا۔

اندھیرے کمرے میں شہری اسی طرح بیٹھی ٹارچ کی روشنی فائلز پہ ڈال رہی تھی۔ دفعتاً" وہ سیدھی ہوئی اور گردن تھکاوٹ کے انداز میں دائیں بائیں موڑی' تو چونکی۔ تیسری ٹارچ کی روشنی دکھائی نہ دی تو اس نے جلدی سے ٹارچ الماری پہ ڈالی۔

وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ حواس باختہ سی اٹھی اور باہر دوڑی۔ راہداری' دوسرے آفسز کے مقفل دروازے' زینہ' سب سنسان پڑے تھے۔ اس نے بے اختیار ماتھا چھوا۔

"اوہ نو۔" پھر پیچھے گھومی اور چلائی۔ "وہ بھاگ گیا ہے' جاؤ اسے ڈھونڈو۔" آفیسر ہڑبڑا کے اٹھا اور باہر لپکا۔ وہ اب پریشانی سے فون کان سے لگائے ہوئے تھی۔

"ہاشم۔۔۔ پولیس مت بھیجو۔ وہ جاچکا ہے۔ میرا کیا قصور؟ مجھے واقعی۔ علم نہیں ہوسکا۔" وہ جھنجلا کے کہہ رہی تھی۔

✲ ✲ ✲

شمعیں باغی ہیں خاک کر دیں گی
آندھیوں سے کہو سدھر جائیں

احمر شفیع کے فلیٹ کی بلڈنگ اسی طرح سر اٹھائے کھڑی تھی۔ اس کے اوپر۔۔۔ آسمان پہ چمکتا ہوا تھال جیسا چاند نظر آرہا تھا۔ زیر زمین پارکنگ میں کار کھڑی کرکے سعدی باہر نکلا۔ سر پہ کیپ تھی' آنکھوں پہ گلاسز تھے' اور دونوں ہاتھوں میں گروسری کے شاپر پکڑ رکھے تھے۔ مصروف سے انداز میں جیسے کوئی تھکا ہارا مکین گھر کو لوٹتا ہے' وہ سیدھا لفٹ تک آیا اور گارڈز کو نظر انداز کرکے اندر سوار ہوگیا اور مطلوبہ بٹن دبا دیے۔ لفٹ منزل بہ منزل فضا میں اوپر سفر کرنے لگی۔ احمر کا فلور آیا تو وہ باہر نکلا۔ سامنے مخالف سمت میں کئی دروازے بند پڑے تھے۔ سعدی جلدی سے نیچے زمین پہ بیٹھا' اور دونوں لفافوں سے پیکٹ نکالے' پھر ان کو کھول کے زمین پہ الٹنے لگا۔ ان میں سرمئی سفید سا سفوف تھا جس کی عجیب سی بدبو تھی۔ سفوف کا ڈھیر لگا کے اس نے احتیاط سے ادھر ادھر دیکھا۔ کہیں کوئی آتو نہیں رہا؟ مگر راہداری سنسان پڑی تھی۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے دوسرے لفافے سے ایک بوتل نکالی' ڈھکن کھولا' دوسرا ہاتھ ناک پہ جمایا اور مائع سفوف پہ الٹ کر ایک دم پیچھے ہٹا۔ سرسر کی آواز آئی اور نہ کوئی آگ لگی' نہ شعلے بلند ہوئے' مگر سفوف جلنے لگا' اور سیاہ دھواں فضا میں بلند ہونے لگا۔ شاپرز وغیرہ کو ڈسٹ بن میں پھینکا' وہ تیزی سے دیوار پہ لگے فائر الارم تک آیا اور اسے کھینچ دیا۔ پھر بھاگ بھاگ کے چاروں دروازوں کو کھٹکھٹانے لگا۔ مگر فائر الارم کی آواز اتنی بلند تھی کہ دستک کی ضرورت ہی نہ تھی۔ پوری بلڈنگ ایک دم جاگ اٹھی تھی۔ ساری راہداری دھوئیں سے بھر گئی تھی' جیسے نچلے فلور پہ آگ لگی ہو اور دھواں اٹھ کے یہاں تک آرہا ہو' اور سعدی یوسف ناک پہ ہاتھ رکھے' ایک ایک دروازہ بجا رہا تھا۔

"باہر نکلو۔ آگ لگی ہے۔ جلدی نکلو۔" احمر کا دروازہ بجا کے وہ دھڑکتے دل سے چلایا تھا۔

✲ ✲ ✲

یہ جو ٹھہراؤ بظاہر ہے' اذیت ہے میری
جو تلاطم مرے اندر ہے سکوں ہے میرا

وہ خوب صورت ہوٹل آج بھی روشنیوں سے منور اور عالی شان دکھتا تھا جیسا کہ ماہ کامل کی اس حسین رات میں اسے لگا تھا۔ رات کے گیارہ بجنے کے باوجود لابی میں خاصی گہما گہمی تھی۔ زمر لبوں پہ مسکراہٹ

سجائے، سیاہ جھلملاتے لباس میں تیار سی ادھر ادھر چھو گھماتی آگے بڑھ رہی تھی۔ نظریں فارس کو تلاش کر رہی تھیں۔ سارا دن اس کو دیکھا نہیں تھا، وہ واقعی اسے مس کرنے لگی تھی۔

"فارس غازی کے نام سے ٹیبل ریزروڈ ہے؟" اس نے استقبالیہ پہ کھڑے باوردی افسر سے پوچھا۔

"جی، ادھر آجائیے۔" وہ اسے مودب سے انداز میں آگے لے گیا۔ وہ مسکراہٹ دبائے آگے چلتی گئی۔

ہاشم کاردار کے آفس میں صرف ایک بتی روشن تھی۔ یا پھر کونے میں رکھے ایکوریم کی بتیاں جل رہی تھیں۔ عجیب نیم تاریکی پُراسرار سا ماحول بنا ہوا تھا۔ وہ شرٹ کے کف موڑے کھڑا، رئیس کے کندھے کے اوپر سے جھک کر اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ چہرہ سپاٹ تھا مگر آنکھوں میں چمک تھی۔

"وہ ہوٹل میں آگئی ہے سر!"

"گڈ۔ تمہیں کیسے پتا چلا وہ اس ہوٹل کا رخ کرنے جائے گی؟"

"کیونکہ وہ چند دن پہلے غازی سے فون پہ کہہ رہی تھی کہ اسے اس ہوٹل میں ڈنر کرنا ہے۔ شاید وہ اس سے پہلے بھی یہاں آچکے ہیں۔"

"ویری گڈ۔ اب اس کو کال ملاؤ۔ اور ہاں، فارس کے سگنلز کھول دو۔ اب تک وہ گھر پہنچ گیا ہوگا، اس کو پریشان ہونے دو۔" کھیل شروع ہو چکا تھا، وہ دلچسپی سے کہہ رہا تھا۔ مزا تو اب آنے لگا تھا۔

"راجر، باس!" رئیس نے سر کو خم دیتے چند کلکس کیے اور پھر اسپیکر پہ گھنٹی جانے کی آواز سنائی دینے لگی۔

آبدار عبید اپنے کمرے میں بیٹھی لیپ ٹاپ پہ کام کر رہی تھی جب دروازہ زور سے بجا۔ اس کے ابرو بھنچے۔ گردن موڑ کے دیکھا۔

"اندر آجاؤ۔" تحکم مگر ناگواری سے پکارا۔ دروازہ کھلا اور سامنے ملازمہ نظر آئی۔

"ہاشم کاردار صاحب نے آپ کے لیے کار بھیجی ہے۔ آپ کو آفس بلوایا ہے۔" وہ بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی۔ ذرا حیران ذرا پریشان۔

"بابا کہاں ہیں؟"

"وہ گھر نہیں آئے۔"

"میری کار نکلواؤ، ڈرائیور اور دو گارڈز کو کہو تیار رہیں، میں آرہی ہوں۔" ملازمہ کے جاتے ہی اس نے تیزی سے موبائل اٹھایا۔ اوپر ہاشم کا پیغام جگمگا رہا تھا۔

"آفس۔ اباؤٹ فارس غازی"

چار الفاظ میں ساری بات ہی ختم کردی تھی اس نے۔ وہ چند لمحے متذبذب سی کھڑی رہی۔ پھر پلٹ کے خود کو آئینے میں دیکھا۔ سفید لمبی قمیص کے ساتھ سفید ٹراؤزر پہنے، وہ سرخ بالوں کو کیچر میں اونچا باندھے ہوئے، عام سے حلیے میں نظر آتی تھی۔ دل اتنا پریشان ہوگیا تھا کہ لباس بدلنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے جلدی سے سرخ رومال اٹھایا، ماتھے کے اوپر باندھا، بالوں کو پھر سے کیچر میں کسا اور باہر کو لپکی۔

ہوٹل کا ریستوران ایریا زرد روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ پس منظر میں بجتی مدھم سروں کی موسیقی، جا بجا بجے خوشبودار پھول، اور اس کی میز کے وسط میں رکھی موم بتی، سب مل کر خوب صورت پُرفسوں ماحول بنائے ہوئے تھے۔ وہ کہنیاں میز پہ رکھے ہتھیلیوں پہ ٹھوڑی گرائے منتظر سی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ انتظار کی خوشی اب بے چینی اور فکر میں بدلتی جا رہی تھی۔

احمر کے اپارٹمنٹ کا دروازہ دھڑا دھڑ کھٹکھٹایا جا رہا تھا۔ دروازے کی درز سے دھواں اندر بھی داخل ہو رہا تھا۔ باہر لوگوں کی چیخ و پکار الگ تھی۔ کمرے میں نیچے بندھے احمر نے چونک کر وہ فائر الارم سنا تھا، پھر اس نے تینوں کی طرف سر گھمایا جو ایک دم پریشان ہوگئے تھے۔

"بلڈنگ میں آگ لگ گئی ہے۔"

"ہو سکتا ہے یہ فالس (جھوٹا) الارم ہو۔" سرغنہ مشکوک تھا۔

"کیا کر رہے ہو؟ نکلو یہاں سے، ورنہ ہم سب جل کر مر جائیں گے۔" احمر شفیع چلایا تھا۔ سرغنہ ابھی تک متذبذب دکھائی دیتا تھا، مگر دوسرے دونوں اغوا کار جلدی جلدی ساری نقدی، چیک بکس، کارڈز وغیرہ

زیورات والے بیگ میں بھرنے لگے۔

باہر کا شوروغل پہلے سے مزید بڑھ گیا تھا۔ سرغنہ چند لمحے کھڑا دیکھتا رہا' پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔ لاؤنج عبور کیا' اور بیرونی دروازہ کھولا۔ پھر ایک دم پیچھے کو ہٹا۔ باہر دھواں ہی دھواں تھا۔ سیاہ گہرا دھواں۔ وہ کھانستے ہوئے ذرا سا آگے بڑھا۔

"کیا ہوا ہے' کدھر آگ لگی ہے؟" اس نے ادھر ادھر بھاگتے لوگوں سے پوچھا۔ چیخ و پکار اور افراتفری میں ایک جملہ کان میں پڑا تھا۔ "آگ نہیں ہے' کسی نے کوڑا جلایا ہے شاید' دھواں ہے اس کا۔" وہ لوگ بالٹی بھر بھر کے اس سڑتے سفوف پہ ڈال رہے تھے' جس سے دھوئیں کا رنگ مزید گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

"اوہ۔" سرغنہ فوراً" اندر کو لپکا اور دروازہ بند کیا۔ اپارٹمنٹ کے اندر بھی کافی دھواں بھر چکا تھا۔ وہ کھانستا ہوا آگے آیا اور احمر کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ احمر بندھا پڑا تھا اور وہ دونوں جلدی جلدی چیزیں سمیٹنے میں لگے تھے۔

"کوئی آگ واگ نہیں لگی۔ ذرا سا دھواں ہے بس۔ واپس رکھو سب کچھ۔ ہم کہیں نہیں جا رہے۔" وہ ڈپٹ کے بولا تو احمر کی رنگت پھیکی پڑنے لگی۔ اس نے بے چینی سے گھڑی کو دیکھا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ سرغنہ کرسی کھینچ کے پھر سے اس کے سامنے آ بیٹھا۔

"چلو پھر سے تفتیش شروع کرتے ہیں۔ ہاں تو مزید کتنا پیسہ ہے تمہارے پاس؟"

☼ ☼ ☼

آدمی کو خدا نہ دکھلائے
آدمی کا کبھی خدا ہونا

روشنیوں سے مزین ہال کی چند میزیں ہی بھری تھیں' باقی سب خالی تھیں۔ لوگ اٹھ اٹھ کے اب جانے لگے تھے۔ زمر اداسی سے بیٹھی گھنگریالی لٹ انگلی پہ لپیٹ رہی تھی' جب اس کا فون تھرتھرایا۔ اس نے گہری سانس لے کر اسے کان سے لگایا۔

"کہاں ہو تم فارس؟"

"تم کہاں ہو؟ میں کب سے انتظار کر رہا ہوں تمہارا۔"

"انتظار تو میں کر رہی ہوں۔ ریسٹورنٹ ایریا میں بیٹھی ہوں۔ تم بتاؤ' تم کہاں ہو' میں وہیں آ رہی ہوں۔"

"اوہ میں سمجھا ابھی تم پہنچی بھی نہیں ہو گی۔ میں اوپر ہوں۔ ففتھ فلور پہ۔ روم نمبر 507 میں۔ تم ادھر ہی آ جاؤ۔ ہمارا گواہ یہاں ہی ہے۔"

"گواہ۔" وہ پرس اٹھاتے ہوئے ٹھٹکی' پھر ایک نظر میز پہ سجے پھولوں کو دیکھا۔ "گواہ سے ملوانا تھا؟ واقعی؟ تو یہ ٹیبل کیوں ریزرو کروائی تھی؟"

"آ جاؤ پھر بتاتا ہوں' جلدی۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

زمر چہرے پہ خفگی کا تاثر سجائے' فون کان سے لگائے اٹھی اور آگے بڑھنے لگی۔ "ویسے کون ہے یہ گواہ؟"

"تم خود دیکھ لو گی۔"

"اچھا مگر یہ ہوٹل میں کیوں ہے؟" وہ لفٹ کے سامنے جا رکی۔ تین لفٹس کے بند دروازے نظر آ رہے تھے۔ سب اوپر تھیں۔ اس نے باری باری تینوں کو نیچے آنے کا بٹن پریس کیا۔ جو جلدی آ جائے غنیمت ہو گی۔

"کچھ فائلز تھیں اس کے پاس' اس سے لینے کے لیے یہاں آنا پڑا۔ آرام سے دے نہیں رہا تھا تو۔۔۔ کمپرومائز پوزیشن میں لانا پڑا۔" لفٹ آ کے نہیں دے رہی تھی۔ تب ہی اس نے دیکھا' کونے والی لفٹ آ چکی تھی اور دروازے کھل گئے تھے۔ اندر سے وہ خالی تھی۔ وہ اس کی طرف بڑھ گئی۔

"اوہ گاڈ کیا کیا ہے تم نے اس کے ساتھ؟ اچھا مجھے مت بتاؤ۔" لفٹ میں داخل ہوتے ہی اس نے 5 کا ہندسہ دبایا اور فون کان سے لگائے بولی۔ "مجھے اپنے جرم کا گواہ مت بنانا۔"

"تم میرے خلاف گواہی نہیں دے سکتیں۔"

"اچھا، وہ کیوں؟" وہ مسکراہٹ دبائے پوچھ رہی تھی۔ لفٹ کی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی، وہ کن انکھیوں سے لفٹ کی دو مخالف دیواروں کو دیکھ سکتی تھی جو آئینے سے ڈھکی تھیں۔ دائیں بائیں جیسے گویا دو بڑے بڑے آئینے لگے ہوں۔ پیچھے کی دیوار لوہے کی تھی۔

"کیونکہ تم میری بیوی ہو اور Privilge Spousal کے تحت تم میرے خلاف گواہی نہیں دے سکتیں۔ اب آجاؤ، میں انتظار کر رہا ہوں۔"

زمر ایک دم بالکل ٹھہر گئی۔ لفٹ فضا میں اوپر کو اٹھ رہی تھی۔

"Spousal Privilge" اس نے دہرایا۔

(یہ قانون شہادت میں ایک آرٹیکل ہے، جس کے تحت میاں بیوی کو دوران شادی کی گئی گفتگو کے بارے میں ایک دوسرے کے خلاف گواہی دینے پہ مجبور نہیں کیا جاسکتا، ماسوائے اس کے کہ کیس وہ دونوں آپس میں لڑ رہے ہوں، جیسے طلاق، بچوں کی کسٹڈی یا کوئی اور کیس۔)

"ہاں، ہزبینڈ وائف پریویلیج۔"

"اور آرٹیکل نمبر کیا ہے اس کا؟" زمر کی سوچتی نظریں لفٹ کی ننھی اسکرین پہ لگی تھیں جس پہ ہندسے بدل رہے تھے۔ دوسرا فلور، تیسرا...

"کیا؟" وہ جواباً بولا تھا۔

رئیس نے ٹائپ کرتے ہوئے گڑبڑا کے ہاشم کو دیکھا۔ "اس کو شک ہو گیا ہے شاید۔"

"تم عموماً آرٹیکلز کو ان کے نمبرز کے ساتھ کوٹ کرتے ہو، مجھے متاثر کرنے کے لیے، آج نہیں کیا تو میں پوچھ رہی ہوں کہ اس کا آرٹیکل یاد ہے یا بھول گیا؟ آخر ٹیچر رہی ہوں میں تمہاری۔" وہ محتاط سا پوچھ رہی تھی۔

(ہاشم تیزی سے کی بورڈ پہ جھکا اور ٹائپ کرنے لگا۔)

"میں اس وقت کافی فکر مند ہوں، اور تمہارا منتظر بھی اس لیے کہہ نہیں سکا۔ قانون شہادت آرٹیکل... خوش؟" خفگی سے بولا تھا وہ...

لفٹ کا نمبر 4 سے بدل کر اب 5 ہو گیا تھا۔ دروازے کھلے مگر زمر باہر نہیں نکلی۔ ایک گہری سانس لے کر وہ بولی تھی۔

"اور جس فارس غازی کو میں جانتی ہوں، وہ انتہائی بے کار اسٹوڈنٹ تھا۔ (اس نے دروازے بند ہونے کے بٹن پہ انگلی رکھی اور گراؤنڈ فلور پریس کیا۔) اور اس کو اس قانون کا آرٹیکل نمبر یاد ہونا تو دور کی بات اس کو یہ تک معلوم نہیں ہو گا کہ قانون شہادت میں ایسا کوئی آرٹیکل ہے بھی یا نہیں۔ مگر وہ واحد شخص جو انگلیوں پہ آرٹیکلز یاد رکھتا ہے، وہ ہاشم کاردار ہے، اس لیے بہت شکریہ میری اینورسری برباد کرنے کے لیے ہاشم، مگر میں اب مزید تمہاری اسکیم کا حصہ نہیں بنوں گی۔ سنا تم نے؟" وہ صدمے اور دکھ سے چلائی تھی۔

دوسری جانب چند لمحوں کی خاموشی چھا گئی۔ لفٹ نیچے اتر رہی تھی۔ 3... 2... 1...

"اب بہت دیر ہو چکی ہے، ڈی اے۔" فارس کی آواز میں کہا گیا اور لائن مردہ ہو گئی۔ زمر کی رنگت دہکنے لگی تھی۔ اس نے فون پرس میں ڈالا اور لفٹ کے دروازے کو دیکھنے لگی۔ دل و دماغ میں طوفان برپا تھے۔

1 سے 6 ہوا اور پھر... لفٹ ہنوز نیچے اتر رہی تھی۔ وہ چونکی۔ جلدی سے بٹنوں پہ ہاتھ مارا۔ دروازہ کھولنے کا بٹن دبایا۔ ایگزٹ۔ بار بار مگر بٹن مردہ تھے۔ لفٹ نیچے کا سفر کرتی جا رہی تھی۔ B1 اور پھر... B2... اور ایک دم وہ جھٹکے سے رک گئی۔ لفٹ کی بتی جلنے بجھنے لگی۔ ہر طرف سکوت چھا گیا۔

زمر نے پریشانی سے بار بار ایگزٹ دبایا، مگر لفٹ مردہ ہو چکی تھی۔ زمین سے دو منزل نیچے، وہ یقیناً "پارکنگ ایریا۔ وہ بھی تہ خانے کی اندھیر پارکنگ میں رکی ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے لفٹ کے فون کی طرف لپکی، ریسیور کان سے لگایا اور کال کا بٹن دبایا۔ رابطہ ملنے کی ٹون پہ وہ جلدی سے بولی۔ "پلیز ہیلپ می، میں بی ٹو میں لفٹ میں ہوں، لفٹ جام ہو گئی ہے اور..."

"اور میں نے کہا تھا، اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ اب

آپ کی کسی عقل مندی کا فائدہ نہیں، مسز زمر!" وہ ہاشم تھا اور وہ بہت سکون سے کہہ رہا تھا۔ زمر سناٹے میں رہ گئی۔

"کتنے اعتماد اور ڈھٹائی سے اتنے ماہ آپ کورٹ میں میرے خلاف بولتی رہیں، آپ کو کیا لگا تھا؟ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا؟ میں تو سب کچھ ٹھیک کرنے جا رہا تھا۔ میں تو گلٹی تھا، مگر آپ کو انصاف چاہیے تھا۔ یو نو واٹ زمر، اب میں گلٹی نہیں ہوں۔ اب مجھے افسوس نہیں ہو رہا۔ اب میں جان گیا ہوں کہ میں نے تم لوگوں کے ساتھ ایسا کچھ نہیں کیا جو تم ڈیزرو نہیں کرتے۔ تم سب کا یہی انجام ہونا چاہیے۔"

"فارس تمہیں جان سے مار دے گا، ہاشم۔ مجھے باہر نکالو۔" وہ پھٹی ہوئی آواز میں چلائی تھی۔

"فارس کی جان ہی تو لے رہا ہوں۔ یہ اوپر کونے میں کیمرہ دیکھ رہی ہو؟ سی سی ٹی وی کیمرہ؟" زمر نے سفید پڑتے چہرے کے ساتھ سر اوپر اٹھایا۔ "اس میں تمہاری فوٹیج بنتی جائے گی۔ تمہیں مرنے میں ابھی ایک یا سوا ایک گھنٹہ لگے گا۔ تمہارے مرنے کے بعد میں یہ فارس کو دے دوں گا، وہ اسے روز دیکھے گا، اور وہ اس کو دیکھ دیکھ کے پاگل ہو جائے گا، مگر اب مجھے افسوس نہیں ہو گا۔ وہ اسی قابل ہے۔"

"اللہ پوچھے گا تم سے ہاشم۔" اس نے ریسیور واپس پٹخا اور اپنا موبائل نکالا۔ موبائل پہ نو سگنل نظر آ رہا تھا۔ وہ اس کی سم کو ڈس ایبل کر چکے تھے۔ اس اسے واپس بھیجنے کی کوشش کی، ایمرجنسی کال کرنے کی کوشش کی۔ سب بے سود۔ موبائل ناکارہ ہو چکا تھا۔

وہ اسے پرس سمیت نیچے فرش پہ رکھے دروازے تک آئی اور اسے پیٹنے لگی۔ "کوئی ہے؟ ہیلپ می۔ کوئی ہے؟ مجھے باہر نکالو۔" دونوں ہاتھوں سے وہ بار بار دروازہ بجا رہی تھی، بلند آواز میں چلا رہی تھی، مگر کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ تاریک سنسان پارکنگ ایریا میں۔ سطح زمین سے کئی فٹ اندر۔ آہنی دیواروں سے ڈھکے ایک ڈبے میں وہ مقید تھی اور اس سے دو منزلیں اوپر، زمین پہ ٹہلتے لوگوں کو معلوم بھی نہ تھا کہ وہ یہاں ہے۔

"کوئی ہے؟ پلیز مجھے کوئی باہر نکالے۔" گھٹن سے اس کو پسینے آ رہے تھے۔ اس کا سانس بوجھل ہو رہا تھا۔ مگر وہ پوری قوت سے چلا رہی تھی۔ آنکھ سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے تھے۔

"فارس، آجاؤ۔ پلیز آجاؤ۔ فارس پلیز۔۔۔" آواز لڑکھڑا رہی تھی، دل ڈوب رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ ابھی ابھی گھر آیا تھا اور حنین جو اسے بتا رہی تھی، وہ اس کے قدموں سے زمین کھینچ لینے کے لیے کافی تھا۔ لمحے بھر میں ذہن میں سارے پزل کے ٹکڑے آپس میں مل گئے تھے۔ شہری۔۔۔ پولیس۔۔۔ اس کا نو سگنل دیتا فون۔۔۔ وہ بے اختیار باہر کو بھاگا۔ فون آن کر کے دیکھا تو اب سگنل آ رہے تھے۔ اس نے تیزی سے زمر کا نمبر ڈائل کیا مگر آگے سے رابطہ ممکن نہیں کی ٹیپ چلنے لگی تھی۔ وہ چابی لیے باہر کو دوڑا۔

اسٹول پہ کھڑی حنین کے ہاتھوں سے پینٹ برش سب گر گیا تھا۔ وہ چند لمحے تو حق دق، شل سی کھڑی رہی، پھر ایک دم جست لگا کر نیچے اتری اور ننگے پیر باہر کو بھاگی۔

"ماموں! رکیں۔ میری بات سنیں۔"

وہ کار کا دروازہ کھول رہا تھا جب وہ تیزی سے آئی اور اس کا بازو تھام لیا۔ "ہٹو سامنے سے حنین۔" اس کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا، پورا جسم پسینے میں نہا رہا تھا، اور یوں لگتا تھا گویا جان نکل رہی ہو۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"یہ سب ہاشم نے کیا ہے، میں اسے جان سے مار دوں گا۔" وہ غرایا تھا۔

"کیا اس کو نہیں پتا ہو گا کہ آپ یہی کریں گے؟ اگر یہ سب اسی نے۔۔۔ یقیناً یہ سب اسی نے کیا ہے، تو وہ آپ کے انتظار میں ہو گا، وہ آپ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔" وہ کہنے کے ساتھ رو بھی رہی تھی، ابھی تک

اس کی کہنی تھام رکھی تھی۔

"تمہارا دماغ درست ہے؟ زمر مشکل میں ہے' زمر ٹھیک نہیں ہے اور تم کہتی ہو میں ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھا رہوں؟ ہٹو۔" اس نے بازو چھڑایا اور کار کا دروازہ کھولا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔" حنہ نے پوری قوت سے دروازہ واپس دھکیلا' فارس کی انگلیاں درمیان میں آگئیں' مگر اس نے دروازے کو دھکیلے رکھا۔

"اس طرح زمر تو نہیں ملیں گی۔ اس نے زمر کو کسی جگہ پہ بلایا تھا۔ جو آپ دونوں کے لیے یادگار ہے۔ اپنے گھر نہیں۔ ہاشم سے بعد میں نپٹ لیجیے گا' پہلے زمر کو ڈھونڈیں ماموں۔ زمر زیادہ اہم ہیں۔ ہر انتقام' ہر بدلے سے زیادہ اہم۔"

فارس نے آنکھیں بند کیں اور چند گہرے سانس اندر کھینچے۔ اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے تو حنہ نے بھی دروازہ چھوڑ دیا۔

"کسی جگہ کا نام لیا تھا اس نے؟" وہ اب ذرا سنبھل کے اس سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں' مگر ہم ان کے فون کی آخری جی پی ایس لوکیشن چیک کر سکتے ہیں۔" وہ تیزی سے اندر کو بھاگی۔ وہ چند لمحے وہاں کھڑا رہا۔ شاک میں' ملال میں۔ اس کو کیوں لگتا تھا کہ اب وہ لوگ مشہور ہو چکے ہیں' تو ہاشم ان کو نقصان نہیں پہنچائے گا؟ وہ غلط تھا اور وہ غلط عورت کی حفاظت کر تا رہا تھا۔

سر جھٹک کے اس نے چند مزید گہرے سانس لیے اور اندر آیا۔ حنہ اوپر اپنے کمرے میں کمپیوٹر کے سامنے الجھی بیٹھی تھی۔ وہ اس کے کندھے کے پیچھے سے آکر جھکا اور اسکرین دیکھی۔

"انہوں نے زمر کے فون کی لوکیشن کلون کی ہوئی ہے۔ تقریباً" پچاس' پچپن' مختلف جگہوں پہ زمر کے فون کے سگنل اس وقت آرہے ہیں۔" اس نے خوف زدہ ہو کر فارس کو دیکھا۔ "اب کیا کریں؟"

وہ اب پہلے سے ٹھنڈا اور سنبھلا ہوا لگ رہا تھا۔ چند لمحے سوچتی آنکھوں سے اسکرین کو دیکھتا رہا' پھر سیدھا ہوا۔

"میں اسے ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔"

"مگر کہاں؟" وہ فکرمندی سے بولی تھی۔

"ہاشم کے گھر!" اور وہ تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ اب کی بار وہ غصے میں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ صرف کچھ سوچ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

بلڈنگ کی راہداریوں میں چھایا دھواں اب ختم ہوتا جا رہا تھا۔ شوروغل کی آوازیں بھی ماند پڑ گئی تھیں۔ احمر کے فلیٹ کے اندر سیاہ مرغولے بھی بیٹھتے جا رہے تھے۔ ایک آدمی اس کے سر پہ کھڑا تفتیش کر رہا تھا' بے معنی سوالات جو صرف اس کو تھکانے کے لیے دو دن سے پوچھے جا رہے تھے' جبکہ باقی دونوں لاؤنج میں بیٹھتے تھے۔ (سعدی کی غیر موجودگی کا فارس اور حنہ نے نوٹس نہیں لیا؟)

یہ وہی وقت تھا جب ایک نے آواز سنی۔ کھانسنے کی مردانہ آواز۔

وہ ایک دم چونک کے بیٹھا۔ پستول نکال لیا۔ آواز ذرا بلند ہوئی۔ ایک فوراً" دروازے کی طرف آیا اور کان لگا کر سننا چاہا۔ مگر آواز باہر سے نہیں آرہی تھی' وہ اپارٹمنٹ کے اندر سے آرہی تھی۔ لاؤنج میں کھلتے گیسٹ باتھ روم کے دروازے کے پار۔

دوسرے نے آواز کا منبع پہلے ہی تلاش کر لیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں پستول پکڑ کر سینہ تانے دبے قدموں باتھ روم کی طرف جا رہا تھا۔ باتھ روم کے اندر کوئی کھانس رہا تھا۔ اور کھانسے ہی جا رہا تھا۔ اغوا کار باتھ روم کے دروازے کے سامنے' پستول تانے رکا اور پیر سے دروازہ دھکیلا۔ وہ کھلتا چلا گیا۔ اندر سنک پہ جھکا نوجوان بری طرح کھانس رہا تھا۔ بار بار نل سے منہ پہ پانی ڈالتا' پھر کھانسنے لگ جاتا تھا۔ اغوا کار کو چند لمحے سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ یہ گھر میں کیسے گھسا؟ اور اسے دیکھتے ہی گولی مار دینی چاہیے یا نہیں؟ مگر وہ نقاہت سے کھانس رہا تھا۔ اسے کوئی نہیں

ماری جاسکتی تھی۔ وہ تیزی سے آیا اور اسے شرٹ کی پشت سے دبوچ کر باہر کی طرف کھینچا۔

"ارے... کیا کر رہے ہو... کیا کیا کر رہے ہو۔" وہ نوجوان چلایا تھا، مگر وہ پستول اس کی گردن سے لگائے ڈپٹ کر خاموش رہنے کا کہتا اسے اپنے ساتھ گھسیٹ کر آگے لے جانے لگا۔ دوسرا ساتھی سامنے سے آگیا' اس کے ہاتھ میں بھی پستول تھا۔ سعدی نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ "گولی مت چلانا۔ پلیز گولی مت چلانا۔ میں بیمار ہوں۔"

چند لمحوں بعد اسی اغوا کار نے سعدی یوسف کو احمر شفیع کے ساتھ فرش پہ پھینکا تھا۔ ان کے سرغنہ نے بے یقینی سے نووارد کو دیکھا اور پھر اپنے دونوں ساتھیوں کو۔ "یہ کون ہے؟" اور احمر نے اس سے زیادہ بے یقینی سے اسے دیکھا تھا۔

"یہ دھوئیں کے ساتھ اندر آگیا تھا۔ وہی ہے جس کو اس نے دو ہزار روپے دیے تھے۔" سرغنہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہوا۔ اس نے گریبان سے پکڑ کے سعدی کو کھڑا کیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھ کے غرایا۔

"کون ہو تم؟"

سعدی نے باری باری ان تینوں کے چہرے دیکھے۔ "میں احمر کا دوست ہوں۔ اس نے جو نوٹ دیے تھے' ان میں خون لگا تھا' میں یہ دیکھنے آیا تھا کہ وہ ٹھیک ہے یا نہیں۔ مگر اس سے پہلے میں نے ڈھائی گھنٹے پارکنگ ایریا میں بیٹھ کر تم لوگوں پہ نظر رکھی تھی اور تمہارا یہ ساتھی..." اس نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔ "کھانا لینے جب باہر نکلا تھا تو میں نے اس کی تصویر کھینچ لی تھی اور اپنے ایک دوست کو بھیجی تھی' اس نے اس کا شناختی کارڈ نکال دیا تھا مجھے اور وہاں پہ موجود پتے کے خانے میں تمہاری مالکن صاحب زادی صاحب کے ایف ٹین والے گھر کا پتا لکھا تھا اور چونکہ میں بہت مشہور ہوں' تو مجھے پولیس کو بتانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ میں ایک نیوز اینکر کو کہہ آیا ہوں کہ اگر میں ایک گھنٹے تک اس سے رابطہ نہ کروں تو چینل پہ چلا دے کہ صاحب زادی صاحبہ نے مجھے اغوا کر کے مار

دیا ہے۔ مرنے سے پہلے قاتل کا نام بتادینا قانونی طور پہ بہت اہمیت رکھتا ہے' ہے نا' اس لیے تمہارے پاس ایک گھنٹہ ہے۔ ہم دونوں کو اپنی مالکن کے پاس لے چلو اور مجھے ان سے بات کرنے دو' ٹھیک!"

سنجیدگی سے کہتے جھٹکے سے گریبان چھڑایا۔ وہ تینوں ڈرائیور اور گارڈلیول کے غنڈے ایک دوسرے کو تکنے لگ گئے تھے۔ پھر ایک آگے بڑھا اور اس کے ہاتھ پیچھے موڑے۔ سعدی نے مزاحمت نہیں کی۔ چپ چاپ خود کو بندھواتا رہا۔ پھر وہ تینوں تیزی سے باہر نکل گئے۔

احمر ابھی تک بے یقینی سے اسے گھور رہا تھا۔ "اور تم پولیس کو' فارس کو' کسی کو نہیں لے کر آئے؟ کوئی اسلحہ ' کوئی چیز ساتھ نہیں لائے؟"

"ریلیکس۔۔۔ میں اپنی زبان ساتھ لایا ہوں۔" وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔

"لعنت ہے تم پہ سعدی۔ وہ ہمیں مار دیں گے۔" وہ دبا دبا سا چلایا تھا۔

"بے فکر رہو' مجھے اغوا ہونے کی عادت ہے۔ میرا تجربہ اس فیلڈ میں تم سے زیادہ ہے۔ اس لیے چپ کرکے انتظار کرو۔" کہنے کے ساتھ ہی اس نے گھڑی کو دیکھا۔ وہ اب بھی ٹک ٹک کر رہی تھی۔ لمحہ لمحہ ریت کی مانند پھسل رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

زمر لفٹ میں ادھر ادھر ٹہل کر' دروازے پہ ہاتھ مار مار کے اب تھک چکی تھی۔ وہ دروازے کے بالکل ساتھ ٹھنڈے فرش پہ اکڑوں بیٹھ گئی تھی اور بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹ لیے تھے۔ ذرا ذرا وقفے سے وہ مٹھی سے دروازہ بجاتی تھی۔

"کوئی ہے؟ کھولو اسے۔ مجھے باہر نکالو۔" آواز بیٹھ گئی تھی اور آنسو چہرے پہ لڑھک لڑھک کر خشک ہو چکے تھے اور اپنے نشان چھوڑ گئے تھے۔ وہ بار بار ذہن سے اپنے دیے گئے خیال کو جھٹکتی تھی۔ ہاں اسے دمہ تھا' مگر آج وہ کوئی اٹیک خود پہ نہیں ہونے دے گی۔ وہ چند گھنٹے گزار لے گی اور صبح تک کوئی اسے نکال ہی لے گا۔ ہاشم اس کی موت کو حادثاتی دکھانا چاہتا ہے تو اب بم سے تو نہیں اڑائے گا نا اسے۔ بس چند گھنٹے اور۔۔۔

ٹپ۔۔۔ ٹپ۔۔۔ کوئی عجیب سی آواز تھی' جس پہ اس نے چونک کے گردن گھمائی۔ آگے پیچھے دائیں بائیں۔۔۔ ہر طرف دیکھا۔ یہ کس شے کی آواز تھی؟ پھر گردن اٹھائی تو منہ کھل گیا۔ لفٹ کے اوپر' کسی ننھے سے سوراخ سے پانی کی باریک سی دھار نیچے گر رہی تھی۔ زمر کی نگاہوں نے دھار کا نیچے تک تعاقب کیا۔ وہ لفٹ کے فرش پہ پانی گرا رہی تھی۔

ایک گھنٹہ لگے گا تمہیں مرنے میں! اس کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ ایک گھنٹے میں وہ لفٹ پانی سے بھر جائے گی۔ وہ اسے ایک زندہ انسان کا آب زیدان بنانے جا رہا تھا۔ وہ اسے ڈبو کے مارنا چاہ رہا تھا۔ او خدایا۔ وہ تیزی سے کھڑی ہوئی اور پھر سے دروازہ پیٹنے لگی۔

"مجھے باہر نکالو۔ پلیز کوئی ہے۔۔۔ پلیز میری مدد کرو۔" اس دفعہ آواز میں خوف اور وحشت تھی۔

اندھیرے آفس میں بیٹھا ہاشم سنجیدگی سے اسکرین پہ نظر آتی فوٹیج کو دیکھ رہا تھا۔ پانی نے فرش کو گیلا کرنا شروع کر دیا تھا اور وہ لڑکی اب بدحواس ہو رہی تھی۔

"یہ مرنے کا کتنا شان دار طریقہ ہوگا' فارس غازی! ایکوریم میں مرنا۔" اس نے زیر لب تبصرہ کیا۔ رئیس نے صرف ایک خاموش نظر اس پہ ڈالی اور اپنا کام کرنے لگا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)